DR ZAKIR HUSAIN LIBRARY

DUE DATE

Cl. No ________ *Acc. No* ______

Late Fine Ordinary books **25 p.** per day, Text Book **Re. 1 -** per day, Over night book **Re. 1/-** per day.

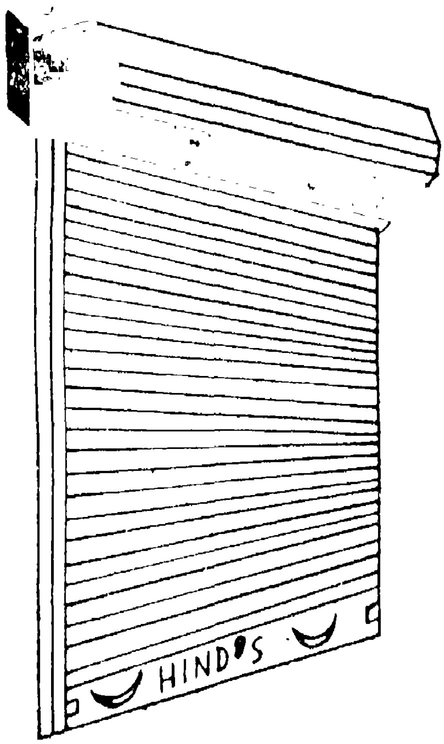
خالص علمی، ادبی اور تحقیقی رسالہ

پہچان

چیف ایڈیٹر
نعیم اشفاق

With best COmpliments of:—

Phone:- 85-230



MANUFACTURER OF:

ALL TYPES OF ROLLING SHUTTER, COLLAPSIBLE GATE, STEEL WINDOWS, DOORS, STEEL FURNITURES, & STEEL ALMIRAS ETC

HIND COLLAPSIBLE GATE CO.

NEAMAT PUR (BURDWAN)

COLMINO ENGG.

DHANSAR (DHANBAD)

خالص علمی ادبی اور تحقیقی رسالہ

سہ ماہی

رسالہ آسنسول

سرپرست

سید محمد جلال حمیدی

بنگراں

گوپی چند نارنگ - بانی

مجلس مشاورت

قاضی عبد الستار

جوگندر پال

مظہر امام

کرامت علی کرامت

ڈاکٹر احمد سجاد

محمد رحمن کوثر

شریف احمد رشد

نذیر احمد یوسفی قیام نیر

ہم کاروان

شمیم عالم مصحفی، حافظ شمس

شاہد محمد جلیل۔ شکیل انور

چیف ایڈیٹر

نعیم

مدیر

عشرت بیتاب

معاون

اقبال سلیم

مالک طابع ناشر

محمد عطاء الرحمن انصاری

مطبع: بیوٹی آرٹ پریس، آسنسول

کتب مستقر مفطر

اردو سماجی سبھا، مقصدی محلہ آسنسول ۷۱۳۳۰۲ (مغربی بنگال)

اداریہ

کیا پتہ تھا کہ "پہچان" کے اس صفحہ پر ایک عالمی سانحہ پر اظہارِ افسوس بھی لکھنا پڑیگا ـــــ ذوالفقار علی بھٹو کی سزائے موت ـــــ ایک عالمی سانحہ سے کم نہیں۔ یہ خونِ ناحق، ـــــ دل و دماغ چیخ رہے تھے، کانوں پر اعتبار نہیں ہوا ـــــ اس قدر وحشیانہ اقدام، معاذ اللہ

بھٹو ایک انقلابی تھا، ادب کا بھی ایک آدمی تھا، وہ اپنے کو شاعر کہتا تھا۔ انہوں نے اپنا کتبہ قبر خود لکھا تھا:

"میں جو سالہا سال ایک شاعر اور انقلابی رہا،
اور اب بھی ہوں ـــ اپنی روح کے قفسِ عنصری
سے پرواز ہونے تک ایسا ہی رہونگا۔"

؎ مرنے والے کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں

فنکار بھی دنیا کی آگہی عام لوگوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی شدید ہوتی ہے ـــــ بھٹو کی موت پر ہم جتنا آہ و زاری کریں کم ہے، فوجی حکومت کے خلاف جتنے نعرے لگائے جائیں کم ہے ـــــ کاش ادیبوں دانشوروں کی ایک ایسی عالمی (بین الاقوامی) انجمن ہوتی جو دنیا کے کسی بھی حصے میں ہونے والے انسانی مظالم کے خلاف آواز اٹھاتی اور انسانی تحفظات پر زور دیتی۔

کیا وجہ ہے کہ آج فنکار کا "قلم" کوئی اہم رول نہیں ادا کر رہا ہے؟ ظلم کے خلاف خواہ وہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں ہو آواز اٹھانے میں ہم خوف محسوس کیوں کرتے ہیں؟

تاریخ شاہد ہے کہ فرانس اور روس کے انقلاب کی اہم وجہ روسی اور فرانسیسی دانشوروں کے افکار ہی تھے جس نے ان دونوں قوموں کی تاریخ کو یکسر بدل دیا۔ کاش آج فنکار کا اپنے اندر ذمہ داری کا احساس ہو

فہرست

مقالے

تعارفی مضامین

افسانے

غزلیں

نظمیں

سالانہ چندہ (اردو رسالہ)
۰ صدف ۔ آسنسول
مغربی بنگال

سید سہیل واسطی (مرحوم)

غزل

محویتِ خیالِ دوست صبح سے شام ہو گئی
آج بھی ایک رات کی نیند حرام ہو گئی

نقد و بیان کا انتخاب اپنا کمال ہو کہ نہ ہو
اس کی تنزلی گفتگو حسنِ کلام ہو گئی

غوق نے روپ دھار کر تیرا فریب دے گیا
یعنی مری نگاہ خود بادہ بجام ہو گئی

پھونک گئے سوزِ ہجر میں دل کو زمانہ خوش نہ ہو
آگ تو اس کی ہتھیلی پر امن و سلام ہو گئی

چونک پڑی ادا روش و دشت بھی اٹھی گلی گلی
ہم نے تو یہ سمجھ لیا مست خرام ہو گئی

فن کی نگاہِ انتخاب لڑ گئی جب ان سے سہیل
ان کی غزل بھری نظر جھینپ کر رام ہو گئی

محبوب الورٰی

حضرت سید سہیل واسطی مرحوم کی نذر

تُربت سے

لہولہان صدا، رائیگاں حیات مری — اداس لمحوں کی دہلیز پر [illegible]
لبوں پہ خشک تبسم کی آبلے سے جاگیں — دلِ فسردہ کے بادل سے [illegible]

کوئی نہیں تھا کہ دل میں مرے اتر جاتا
کوئی نہیں تھا کہ بے خواب دھڑکنیں سنتا

یہ علم و فن، یہ تلاش و طلب، یہ فکر و ہنر — میں اپنے سینے سے کس طرح [illegible]
یہ شستِ صبحِ تخیل، دل و نظر کی کشید — میں کس کے جامِ سفالی میں [illegible]

نہ کوئی پیاس کا صحرا، نہ کوئی دشتِ صدا
میں اپنے دل کی گذرگاہ پر بھٹکتا رہا

یہ کس کی شاخِ تمنا کو میں لہو دیتا — یہ کس کے رخ پہ میں چھینٹے وضو کے دیتا
ہر ایک شخص تھا خود ہی قتیلِ کج کلہی — کسے اذاں کسے اپنی ادا کی خو دیتا

فغاں کی سرحد پہ مری آہِ نارسا پہنچی
کبھی نہ بابِ اثر تک مری دعا پہنچی

نظر نظر مری خود داری حیات لٹی — تمام عمر کی لاحاصلی میں دل کی بساط لٹی
سفر سفر مرے درپیش تھی زمینِ بلا — جہاں جہاں میں گیا مری کائنات لٹی

جبیں جبیں مرا کشکولِ آرزو ابھرا
گھٹا گھٹا میں برس کر بھی تشنہ کام رہا

تمام عمر مرا حادثوں نے ساتھ دیا — وہ حادثے جو مجھے معتبر سمجھتے رہے
وہ آگ آگ گذرگاہ کا سفر میرا — وہ زہر زہر پیالے مرے نصیب بنے

مرا نصیب کہ غم میری ہی پناہ میں تھا
تمام درد کا محور مری نگاہ میں تھا

تعلقات کے ریشہ رشتے خاک نمو تھا جو ـــ مرا وجود سلگتا رہا سوالوں میں
صدائے درد کا اک آسمان اٹھائے ہوئے ـــ میں اقتباس جذبہ بھرتا رہا حوالوں میں

تڑپتی روح یہ خود رستہ جسم و جاں دیتا
یہ آس کو اپنی سلگتی ہوئی زباں دیتا

میں ایک صلیب غزل نے میری صدائیں لیا ـــ مگر حروف کہ کانٹوں کا تاج بنتے گئے
میں خواب خواب سلاخ صلیب شہر میں تھا ـــ مری نگاہ تپیدہ میں خواب جلتے رہے

بدلتے بھاگتے لمحات میں حصار شدہ
خیال آبلہ پائی پہ مسکراتا رہا

اور اب سکون مسلسل سکون و راحت ہے ـــ یہاں نہ غم ہے نہ کوئی بلائے کلفت ہے
نہ آرزو نہ طلب ہے نہ کوئی چاہت ہے ـــ لبوں پہ آہ نہ شکوہ نہ اب شکایت ہے

زمیں سر پہ تنی ہے زمیں بچھونا ہے
یہاں نہ چاندی کا تن ہے نہ کوئی سونا ہے

کچھ اتنی دور پہنچا ہے قافلہ میرا ـــ صدائے چاک گریباں بھی سن نہیں پاتا
کسی کی پلکوں کی شاخوں کی گوہر نایاب ـــ میں اپنے دامن ویراں میں چن نہیں پاتا

یہاں کسی کو میسر نہیں کسی کی دید
نہ گرم جوشی اوصاف نہ دوستی مجید

وہ ایک گوشہ راحت، وہ دوری جانے پناہ ـــ گماں یہ ہوتا ہے سناٹے کی دعا ہوگی
نہ دور گرمی بادہ نہ آتش سیّال ـــ نہ اب تصادوں میں وہ لذت بلا ہوگی

نہ جانے کیسے ہیں مشتاق و کوثر و منصور
نہ ہو رہے ہیں عزیزان میکدہ کے ظہور

نسیم بھی نہیں آئے ہیں کچھ دنوں سے ادھر ـــ سلیم قادری صاحب کی خیریت نہ ملی
مری طویل علالت کی داستان حیات ـــ نہیں رضوی سے ادریس نے سنی ہوگا

عظیم و شاہد و قدوس و شفیق کیسے ہیں
خیال و خواب کے راستے بھی سونے ہیں

میں جلیل و اشفاق و انجم و آزاد ـــ وہ چہرہ چہرہ وہ دل و نظر ہونگے
یہ میری آخری آرام گاہ سے اب تک ـــ وہ دوستی ہیں واقبال بے خبر ہونگے

وہ اک سراپا دلنواز ادا نسیم آذر
مری جدائی پہ مضطرب ہوں نہیں مظفر

۱ محمد یوسف ۲ عبدالحمید ۳ مشتاق اعظمی ۴ محب الرحمن کوثر ۵ منصور انصاری ۶ نعیم اقبال ۷ ادریس صدر
۸ عظیم الدین اعظم ۹ شاہد رضوی ۱۰ قدوس ۱۱ شفیق ۱۲ شاہ محمد جلیل ۱۳ انجم اشفاق ۱۴ انجم رضوی ۱۵ آزاد مونگیری ۱۶ احمد ۱۷ شاہد اسد آبادی
۱۸ اقبال امام ۱۹ عاصی ۲۰ مظفر عظیم آبادی

نشید شاہدی حضرت رضاؔ[20] شعورؔ[21] و سلام[22] — میں اگر تو مرے سلام و نیاز کہہ دینا

مرے لئے بھی دمِ نے سکونِ قلب ذرا — بوقتِ ختمِ اذاں ... کہہ دینا

میں اپنی ڈگر کی تنہائیوں میں تنہا ہوں

یہ حال تو راز[23] بھی ملتے نہیں کہ بات کروں

نثارؔ[24] عابدؔ[25] و انجمؔ[26] شریف ارشدؔ کو — مری صدا سے تعلق کی گرمیاں دینا

وہ ذائقہ[27] کہ ہے جس میں مرے لہو کا سفر — مرے فسانۂ ہستی کی تر جمانی دینا

خدا نے دی نہیں اولاد میری قسمت میں

لب غزل کی تھی فریاد میری قسمت میں

کبھی جو یاد مری آئے تم کو آخرِ شب — مری غزل کے اجالے میں ڈھونڈھنا مجھ کو

اسی وسیلے سے تم کو ملے گا میرا پتہ — جہاں تلک ہو مرے دل کی داستاں پڑھنا

دعا بدست ہوں اللہ کرے راس آئے تمہیں

تمہارا ذوقِ سفر ہے سپہر زمانے میں

---

۲۰ نواب رضا حسنوی ۲۱ شعور بھاگلپوری ۲۲ سلام ... ۲۳ حضرت ... ۲۴ نثار احمد نثار ۲۵ عابد ضمیر ۲۶ منصور انجم ۲۷ ... روزنامہ اخبار

کوسمس

جی ہاں! اپنی شخصیت کو نکھارنے اور باوقار بنانے کیلئے فوری خدمات حاصل کریں۔

کوسمس جینٹس ٹیلر بہترین فٹنگ نئے نئے فیشن اسٹائل اور منپسند ڈیزائنوں میں ہر طرح کی پوشاکیں تیار کرنے کا واحد مرکز ہے!

کوسمس

جنٹس ٹیلر

نزد جوہر لعل بالکا اسکول اسٹیشن بازار۔ آسنسول ۱۳۳۰۱

میراجی

محمود ہاشمی

میراجی کی ذات کا افسانہ اور میراجی کی شاعری، جدید ذہن کا آمیختہ ہے۔ اس ایک شخصیت میں کئی بر اعظموں کی ادبی تحریکات، شخصیات اور افکار و خیالات کا اجتماع ہے، اس ایک شخصیت نے نئی شاعری کو اسرار بھی بنایا اور پرانے واہموں کو فراموش بھی کیا۔

ترقی پسندوں کے نزدیک وہ رجعت پسند اور ابتذالی تصورات کا شاعر ہے۔ لیکن الزام تراشی اور ناپسندیدگی بھی میراجی اور نئی شاعری کی راہ میں حائل نہ ہو پائی۔

آج کے جدید ذہن اور عمومی بورژوا معاشرتی فکر کے درمیان جو کشمکش ہے۔ اسی کشمکش کا محور میراجی کی ذات ہے۔ میراجی کی شاعری بھی اسی کشمکش میں اظہار کی علامتی ظفرمندی کو نمایاں کرتی ہے۔ میراجی اور جدید ذہن کے درمیان قدرِ مشترک بظاہر بہت مختصر، لیکن اپنے اندرون میں آج کے ذہن، آج کی دنیا اور آج کے طرزِ احساس کی طویل داستان کو چھپائے ہوئے ہے۔ اس داستان کا رشتہ ۱۸۵۷ء سے شروع ہوتا ہے جب بودلیئر کا مجموعہ "بدی کے پھول" شائع ہوا۔ اور اس داستان کا تسلسل، آج کے فن اور بورژوا سماج کے ہر ایک کشمکش میں قائم ہے۔ اور یہ رشتہ اس وقت تک قائم رہیگا، جب تک کہ تخلیق کو مکمل آزادی اور آزادانہ اظہار [illegible] کیا جاتا رہے گا۔

جدید شاعری کی بنیادیں

میرا جی

کچھ لوگ اردو کی آزاد نظم کو نئی شاعری کہنے لگے ہیں۔ میں ان میں سے نہیں ہوں۔ کچھ لوگ آزاد نظم کے ساتھ موضوع کے لحاظ سے مزدور اور عورت کو ملا کر نئی شاعری سمجھتے ہیں۔ گویا زندگی کا سیاسی، اقتصادی اور جنسی پہلو ان کی نظر [illegible] میں نئی شاعری کا خام مواد ہیں۔ میں انکی بھی نہیں کہتا۔ میرے خیال میں تو نئی شاعری ہر اس موزوں کلام کو کہا جا سکتا ہے جس میں ہنگامی اثر سے ہٹ کر کسی بات کو محسوس کرنے، سوچنے اور بیان دینے کا انداز نیا ہو یعنی کوئی شاعر روایتی بندھنوں سے الگ ہو کر احساس، جذبے یا خیال کے اظہار میں اپنی انفرا[illegible] تو وہ نیا شاعر ہے ورنہ پرانا۔ اور اس طرح اردو ادب کی تاریخ میں نئی شاعری کا [illegible] سے پہلے کبھی کبھار کوئی ایسی بغاوت اور بلبلاہٹ کی روح دکھائی دے جاتی ہے جس نے [illegible] کی کوشش کی۔ لیکن ماحول پر اپنے اثر کے لحاظ سے اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ [illegible] نئی شاعری کا پہلا نمائندہ سمجھیں گے۔ نظیر کے بعد غالب ایسا شاعر ملتا ہے جس کی آئینہ داری بھی معلوم نہیں کب تک جاری رہے گا۔ غالب کے بعد حالی یا آزاد اور اسمٰعیل میرٹھی [illegible] ایک [illegible] انہوں نے چند اصولوں کے مدنظر چند وقتی ضرورتوں کے تقاضے سے شعوری طور پر بعض نئے رجحانات کی طرف رغبت دلائی۔ [illegible] بہت کچھ نظم کو اختیار کیا لیکن ان کا یہ قدم کچھ ایسا تھا جیسے تعلیمی اداروں میں اس گلستاں بوستاں کی جگہ اردو کی درسی [illegible] اور غالب کے بعد گرچہ حالی اور آزاد کی روایات ہی کے سائے میں اس کی ابتدائی نشوونما ہوئی۔ اقبال ہی صحیح معنوں میں ایک نیا شاعر ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک دھندلکے میں چھپا ہوا بیت کا سب سے پہلا شعوری تجربہ شرر لکھنوی کا ہے جنہوں نے [illegible] کے ذریعے آزاد نظم کو رائج کرنے کی ناکام کوشش کی اور اقبال کے پھیلے ہوئے اثرات کے ساتھ ساتھ مولوی عظمت اللہ، عبدالرحمٰن بجنوری، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، سیماب، ساغر اور جوش ابتدائی کشمکش کے بعد کی ترقی یافتہ صورتیں ہیں۔ اور ان سب کے بعد نوجوان شعرا کا ایک ہجوم ہمارے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور اس ہجوم کے پہلو میں نئی صورتیں، نئے موضوع، نئے انداز بیان ایک الجھن پیدا کرتے ہیں۔

نئی صورتیں، نئے موضوع، نئے انداز بیان — شاعری میں ان کی آمد ایک طرح سے داخلی اور خارجی ضرورت کی پابند ہے۔ ابتدائی انسان کی ضرورتیں محدود تھیں۔ اس لیے اس کی شاعری محدود رستوں پر ہی چل سکی۔ بلکہ یوں کہیے کہ اس کی نگاہیں اپنی ضروریات کے دائرے ہی میں شعریت کی تلاش کر سکیں۔ پیٹ بھر کر جسم شبانہ کے ساتھ فراغت کے لمحوں سے لطف اٹھانا، پیٹ بھرنے کے لیے خوراک کی فراہمی اور ڈر — فطرت کے مظاہر سے ڈرنا جیسے ہم جنسوں دشمنوں سے ڈرنا

بس یہی باتیں تھیں جن سے گیت کی بات نکلتی تھی۔ انتہا اور خوف کے دو متوازی خطوط کا درمیانی فاصلہ ابتدائی انسان کی شاعری ہے۔ جب سماجی زندگی کی منازل طے ہوتی گئیں اور تہذیب تمدن کی الجھنوں سے واسطہ پڑا انسان کے تخیل کا ستارہ چمک کر اپنے جلو میں اڑتی ہوئی نورانی دھول سے خیال کے آسمان میں ایک کہکشاں بناتا گیا۔ تہذیب و تمدن کی آمد نے نہ صرف احساس و جذبات کی ادبی تسکین کی بلکہ اس کے بعد ہر طرح کے فطری اور غیر فطری راستوں پر گامزن ہونے لگا۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سوچنے لگا کہ اب کون سے نقطے کو اپنی منزل بنایا جائے۔

ادب شخصیتوں کا ترجمان ہے اور شخصیتیں زندگی کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ آج کل ہماری زندگی ہر مہینے نہیں تو ہر سال ضرور بدلتی جا رہی ہے اور یہاں نہ صرف اقتصادی اور سماجی حالات ادب پر اثر انداز ہو رہے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ ذہنی طور پر خصوصاً مغرب سے آئے ہوئے خیالات سے جہاں ادب اور آرٹ میں فنکار کے نئے اسلوب رائج کرنے کا باعث ہوئے ہیں وہاں اخلاقی لحاظ سے بھی روزمرہ کی باتوں کو دیکھنے کا ایک نیا ڈھب آتا جا رہا ہے بلکہ آ رہا ہے۔

پہلے دور میں ہر بات محدود اور معین تھی۔ اصناف سخن محدود تھیں۔ موضوع شعری کا ایک معین دائرہ تھا اور اس کے ساتھ ہی ہر شخص کا ذہنی افق بھی ایک ہی رنگ کا حامل تھا۔ نئے دور میں موضوعات شعری میں وسعت پیدا ہوئی۔ اصناف سخن میں بھی نت نئے بت ڈھلنے جانے لگے اور ذہنی افق بھی اپنے رنگا رنگ جلوؤں سے نگاہوں کو بھانے لگا۔

آج سائنس کی ایجادات نے ہر ایک چیز کو ہر دوسری چیز سے قریب کر دیا ہے لیکن انسان انسان سے دور ہو چکا ہے۔ مانا کہ وہ پہلی سی آنکھ اور چہل والی بات اب نہیں رہی لیکن ایک دوسرے کو ملنے کیلئے جس خلوص کی ضرورت ہے سوچ کی جو گہرائی درکار ہے وہ ہر کسی کی طبیعت میں باقی نہیں رہی یا کم سے کم مٹتی جا رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ ادب زندگی کے قریب ہوتے ہوئے بھی اکثر دور ہی رہتا ہے۔ پہلے بھی یہی صورت حال تھی لیکن ایک اور انداز میں۔ پہلے اردو شاعری کے راج بھون میں آپ سے پھولوں کی ایک سیج بچھی ہوئی تھی اور اس پر ایک چنچل سندری غزل کا روپ دھارے سولہ سنگھاروں سے سجی بیٹھی تھی۔ تشبیہوں کی داسیاں، استعاروں کے چنور ہلاتی ٹہل سیوا میں مصروف تھیں۔ راج محل میں آنے جانے والے چنچل سندری کی موہنی چھب سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والے اور دل کو گرمانے والے چیدے چنائے گنتی کے چند آدمی تھے اور ایسی الگ اور اچھوتی سبھا میں ہر کسی کو جانے کی جرأت بھی نہ ہو سکتی تھی وہاں وہی جا سکتا تھا جسے راج دربار میں جانے کا سلیقہ ہو جو ایسی محفلوں کے ادب آداب سے واقف ہو۔ جو دوسروں کی سن کر واہ واہ کہہ سکتا ہو۔ اپنی سی کہنے پر نہ تلا بیٹھا ہو۔ نظیر، غالب، اسیر، چند ایسے جادوگر آئے جنھوں نے پرانے روگ کے سروں سے مدد لیکر نیا نغمہ گانا چاہا لیکن سننے والوں کے کانوں میں اپنے اپنے وقت کی گونج بن کر رہ گئے۔ راج محل کے رہنے والوں کی دکھائی نہ دینے والی بیڑیاں کٹ نہ سکیں اور راستہ چلتی، کھاتی پیتی، ہنستی بولتی اپنی باتیں کہتی، دکھ سکھ کی سنگی اور نئے رستوں کی تلاش کرتی ہوئی زندگی محل کے سنہری چوکھٹ کے اندر قدم نہ رکھ سکی۔

اس کے بعد سات سمندر پار ایک جنگلی طوفان اٹھا۔ مغربی تعلیم اور تہذیب و تمدن کی آندھی آئی

خس و خاشاک اڑا لی لیکن اپنے جلو میں نئی کونپلوں کو پروان چڑھنے والی بڑھا بھی لائی۔ اب رفتہ رفتہ نئی نئی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کوئی بولا ادب کو زندگی سے قریب لانا چاہیئے کوئی کہنے لگا ہم اپنے سرمایہ سے دستبردار نہیں ہوسکتے۔ کوئی پکار اٹھا ہم صرف دو تین باتیں جانتے ہیں۔ خلوص اور آزادی اور اس اپنے اپنے راگ کے ہنگامے نے ایک الجھن پیدا کر دی۔ ایک ایسی الجھن جس سے نئی لہریں پھیل اٹھتی ہیں جس سے نکل کر زندگی سفر کی نئی منزلوں کو طے کرتی ہے لیکن جس کا دھندلکا ایک بھول بھلیاں کی مانند ہوتا ہے۔ ایسی بھول بھلیاں جس میں سے چند ہی لوگ صحیح راستے کو دیکھ کر اس پر گامزن ہوسکتے ہیں۔

یہی کیفیت اس وقت شاعری کی ہے اور نیا شاعر ایک ایسے چوک میں کھڑا ہوا ہے جس سے دائیں بائیں آگے پیچھے کئی راستے نکلتے ہیں۔ لیکن اسے پوری طرح نہیں معلوم ہے کہ کون راستہ اس نے طے کر لیا۔ ماضی کے تجربے کی اہمیت رکھتے ہیں۔ کب تک اسے یونہی کھڑا رہنا ہے حال کی اضطراری کیفیت کس حد تک اس کا ساتھ دیں گی اور کون کون سے راستے پر اسکو چلنا ہے مستقبل کے خطرات اسکو کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ نیا شاعر ماحول میں اپنی گہری دلچسپی کا بہانہ کرتا ہے لیکن حقیقتاً وہ صرف اپنی ذات کے دھندلے سے عکس میں کھو ہے اور اس کے آس پاس اب وہ پرانے سہارے نہیں رہے جس کے بل پر گھر بیٹھے جھمیلوں میں سب عمر بسر کر دیئے تھے۔ وہ اکیلا ہے اور اسے سہارے کی جستجو ہے۔ کبھی وہ غلط چیزوں کا سہارا تک پہنچ کر بھی اسے نہیں معلوم ہوتا کہ کیا بات ہوئی اور اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ جس عمارت کو ڈھالنا ہے۔ اس کی بنیادوں کا حال اسے پوری طرح نہیں معلوم ہے۔

اس الجھن کے اسباب ۱۸۵۷ء کے مبہم دور سے شروع ہوتے ہیں، جب سیاسی شیرازہ بکھرنے لگا اور نئے نظام کیلئے جگہ بنی۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ نوجوان شعرا اور ان بزرگوں کے جکڑ ہے۔ جنھوں نے اس ذہنی کشمکش کے دور کو بہ نفس نفیس دیکھا تھا۔ لیکن تاریخ اور نسلی یادیں مل کر گذرے ہوئے زمانے کو ایسا تجربہ بنا دیتی ہیں اس کے علاوہ کسی شخص کی ذہانت، ماضی، حال اور مستقبل سے مل کر بنتی ہے۔ ماضی اسکے بنیادی خدوخال کو ڈھالتا ہے۔ حال اپنی ہر نئی تحریک سے جہان بینی کرتا ہے اور وہ امنگیں جو ارادے بن کر مستقبل میں تکمیل کو پہنچتی ہیں اس کی انفرادیت کو نمایاں کرتی ہیں۔

سیاسی لحاظ سے جب ہم آج کے شاعر کا ماضی اپنے سامنے لاتے ہیں تو ہمیں ملکی حکومت کے زوال سے ابھرنے والے پست خیال کے ساتھ ساتھ نئی تحریکوں کے زندگی بڑھانے والے اجزاء بھی ملتے ہیں اور یہ پہلے زوال کی پستی کی شدت ہی تھی جس نے سیاسی رنگ لیکر اپنے دلیش کا دنیا بھر سے مقابلہ کرتے ہوئے نئی امنگیں پیدا کر دیں اور زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی اور آزادی کی طرف رغبت پیدا کی۔

سماجی پہلو سے غور کرتے ہوئے نئے شاعر کی زندگی میں ہمیں ایک سے زیادہ باتیں الجھاتی ہیں۔ شہروں کے فاصلے مٹے نئی تعلیم آئی اور کنوئیں کا مینڈک سوچنے لگا کہ اسکی ذات اور ماحول سے بالاتر بھی ایک زندگی ہے جس میں ایک اٹل وسعت اپنی گہرائی سے پہلے خیالوں کو ہیچ ثابت کر رہی ہے۔ تعلیم اور تجارت کی آسانیوں نے نئے مقامات کی سیر کرائی اور گھریلو زندگی کا نقشہ مٹنے لگا۔ گھر سے دور ہو کر تنہائی کا احساس نشوونما پانے لگا۔ وہ احساس جیسے ہر طرف بڑھتا

اور بدلتی ہوئی طاقتیں کمتری کے احساس میں تبدیل کرنے لگیں اسکے ساتھ ہی نئے دور میں رفتار حیات کی تیزی کے نے جہاں زندگی کے اختصار کا احساس دلایا وہاں اضطراری کیفیت کی طرف بھی ہر کسی کے ذہن کو مائل کر دیا کہ جوں توں اس چار دن کی چاندنی میں ذاتی خواہشات کی تکمیل کر لینا چاہئے چنانچہ گہرے تنظم تفکر سے ہٹ کر ہر بات کو سرسری نظر سے دیکھنا انسان کا خاصہ بن گیا سطحیت حاوی ہوگئی اور غیر ذمہ داری بڑھ گئی نئے لکھنے والے نوجوان شاعر پیدا ہونے لگے۔ اور شاعری کیلئے جسقدر علم کی ضرورت ہے اس کی طرف بعد میں توجہ کرنے لگے بلکہ اسے یکسر نظر انداز کر گئے اور اسلئے علم یہ کمی جب گہرائی اور احساس فقدان سے ہم آہنگ ہوئی جو نئے شعراء میں اکثر موجود ہے تو اعتراض کی گنجائش نکلی۔ گویا ابھی ایک تجربہ تکمیل کو پہنچا بھی نہ تھا کہ تجربہ کرنے والوں کے دعووں نے مخالف بھی پیدا کر دیئے۔

گھریلو زندگی تخریب اور نئی خواہشات کی تشنگی، یہی دو باتیں مختلف صورتیں اختیار کرکے ہر نئے شاعر کے کلام اور حالات میں دکھائی دیتی ہیں۔ زندگی میں ہر شخص کو کسی نہ کسی سہارے کی ضرورت ہے۔ پہلے اقتصادی لحاظ سے پرانے منظم طریقے سہارے تھے وہ نہ رہے اور مقابلہ کا دور آگیا۔ پہلے نوعی لحاظ سے گھریلو زندگی سہارا تھی اس میں ایک دل جمعی نہ رہی اور اسکے ساتھ ہی تعلیم، ناولوں اور سینما نے مل کر لذت کی نئی راہیں دکھائیں۔ وہ راہیں جنکو دور سے دیکھنے کی اجازت ہے لیکن جن پر چل کر زندگی کو مکمل کرنے کی ممانعت — یہ پہلو بھی تشنہ رہا۔ پہلے ادب کے فنی پہلو میں شعر کے معین دائرے تھے۔ وہ دائرے مٹ گئے یا ایک دھندلکے میں جا چھپے اور نفسا نفسی کے عالم میں اصول بن سکے، یہ سہارا بھی رہا اس حالت میں نیا شاعر ڈولنے لگا اور دنیا کا اصول ہی یہی ہے کہ جسے ٹھوکر لگا اسے دھکا دیتی ہے تاکہ وہ منہ کے بل گرے۔

چنانچہ پہلے سہاروں کے نعم البدل کی کمی کا اظہار ہر نئے شاعر کے کلام میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے لیکن یہاں میں نئی شاعری کا کوئی تصور نہیں اور اگر افادیت ہی مقصود ہو تو اس کی افادیت سے کبھی انکار نہیں نئی شاعری ایک مسلسل تجربہ ہے۔ خامیاں اس میں ہو سکتی ہیں۔ ہر تجربے میں ہوتی ہے لیکن اس کی خوبیاں ہی اہمیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ خامیاں تو وقت کی جانچ پڑتال کے بعد دور ہو جائیں گی اور خوبیاں پہلے سے زیادہ نمایاں اور مسلم۔ اسکے لئے ہمیں اسوقت تک انتظار کرنا ہوگا جب تک ہم سیاسی سماجی اور انفرادی زندگی کے آنے والے کو نہ سلجھائیں اور اس دوران میں ہمیں ہمدردانہ انداز نظر رکھتے ہوئے اس حقیقت کو بھی یاد رکھنا ہوگا کہ نئی شاعری اپنے پابند اور وسیع امکانات کے باوجود ابھی ایک تجربہ ہے، ایک ایسا تجربہ جس سے فوری تکمیل کی توقعات بے معنی اور نامناسب ہیں اور جسکا مستقبل یقیناً روشن دکھائی دے رہا ہے لیکن یہ سب کامیاب نئے شاعروں کے ہاتھ میں ہے اگر وہ بات کے ہر پہلو کو دل لگا کر دیکھیں، خلوص سے اس پر غور کریں اور دل جمعی سے آگے بڑھیں تو چاہے کچھ بھی ہو میدان انکے ہاتھ میں رہے گا۔

منیر نیازی

عام شہروں کی طرح شہرِ ادب بھی ہمیشہ کسی نہ کسی مسئلے سے دو چار رہتا ہے کبھی یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ ادب میں جمود ہے۔ کبھی داخلیت اور خارجیت کا مسئلہ کبھی ترقی پسندی اور رجعت پسندی کا مسئلہ اور کبھی نئی اور پرانی نسل کا مسئلہ۔ ان دنوں اس سلسلے میں نثری نظم کے مسئلے کے بارے میں بحث کے دروازے کھلے ہیں جس کی جھلکیاں ادبی جرائد، اخباروں کے کالموں اور ریڈیو کے مختلف پروگراموں میں دیکھی اور سنی جا رہی ہیں۔ کچھ لوگ خاص طور پر نئی نسل کے لوگ اس کے حق میں ہیں اور کچھ لوگ جن میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جنہیں پرانی نسل کہا جاتا ہے شاعری میں اس رویے کے خلاف ہیں۔ نثری نظم لکھنے والوں کا دعویٰ ہے کہ شاعری میں پابندی کے دن بیت چکے ہیں۔ اور پابند نظم لکھنے والوں کا طرزِ فکر بوسیدہ ہو چکا ہے اس صنفِ سخن کے مخالفوں کا کہنا ہے کہ یہ تحریک چند تن آسان اور تن شاعروں کا جو [illegible]
مفتوح اذہان کی طرح خیال کا رزق مغرب سے بھیک کے طور پر قبول
کرا کے اپنے وطن کو مرعوب و مسحور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کم
بحث کو سمیٹنے والوں کو دونوں جانب [illegible] سی لگتی ہیں
کا بنیادی آئین ہے جب اس نظم اور وزن کی شرائط پوری کر
دینے والے طرزِ فکر [illegible] قیمت رباعی لکھنے والے شاعروں کی کثرت
حال کے خلاف احتجاج کرنے والے بھی پیدا ہو جاتے ہیں حد سے بڑھ جانے والوں کے لیے ان سے متصادم ہونے والے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ یہ صورتِ حال چاہے وقتی اور عارضی ہو مگر پیدا ضرور ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک وقت کی حد تک پہنچنے کے بعد نثری نظم کا عمل جاری ختم ہو جائے پر اس کے وجود کی اتنی افادیت ہی کیا کم ہے کہ اس کی معرفت ایک دیمک خوردہ الفاظ شعر پر [illegible] گزرے گا اور ایک نئے خیال اور اقلیمِ شعر میں ایک نئے نظام کے نافذ ہونے کے امکانات زیادہ روشن ہوں گے۔ نثری نظم لکھنے والوں کی اکثریت بھی ویسی ہے جیسی پابند نظم لکھنے والوں کی مگر ان گروہ کی کمزور تحریروں میں کہیں کہیں خوبصورت ٹکڑے مل جاتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ظاہر کے باطن کا جمال وزن میں محسوس ہوتا ہے ان کا داخلی ردھم خارج کی بے وزنی کی تلافی کرتا دکھائی دیتا ہے۔

محمود کشور کی ایک نظم دیکھیے

جنتوں کے آہنی گیٹ کب کھلیں گے

دشمن درختوں
منافق عبادت کدے
دو غلی ہواؤں سے
خون پیتے دلوں
ہڈیاں چبانے والی راتوں سے
دور اے خدا......

میرے کراچی کے چند روزہ قیام کے دوران وہاں کے مقامی شاعروں اور ادیبوں نے مجھ سے بہت محبت کا اظہار کیا ہے۔ دعوتوں اور محفل آرائیوں کی شکل میں بھی نظموں کی صورت میں بھی..... نثری نظمیں لکھنے والی شاعرہ فاطمہ حسن نے بھی ایک نظم لکھی:—

منیر نیازی کو دیکھ کر

تمہارے ہونٹ سچائی ہیں
تمہاری آنکھیں تمہاری نظمیں
اور تم وہ گہرائی ہو
جس سے اٹھتی ہوئی لہر
مجھے نرم تھپکیاں دے رہی ہے
ساحل کی ریت پر اپنے اپنے نام
لکھے ہوئے لوگ
بے خبر ہیں کہ
لہروں کا نقش
آخری نقش ہے

▲▲

سیاست اور ادب کا سنگم
"محرک" پندرہ روزہ آسنسول

ایڈیٹر
قیام انیس
اسٹوڈیو چھایا۔ ہاٹن روڈ۔ آسنسول
۷۱۳۳۰۱

منیر نیازی

غزل

بے چین بہت پھرنا گھبرائے ہوئے رہنا
اک آگ سی جذبوں کی دہکائے ہوئے رہنا
چھلکائے ہوئے پھرنا خوشبو لبِ لعلیں کی
اک باغ سا ساتھ اپنے مہکائے ہوئے رکھنا
اس حسن کا شیوہ ہے جب عشق نظر آئے
پردے میں چلے جانا، شرمائے ہوئے رہنا
اک شام سی کر رکھنا کاجل کے کرشمے سے
اک چاند سا آنکھوں میں چمکائے ہوئے رکھنا
عادت ہی بنا لی ہے تم نے تو منیر اپنی
جس شہر میں بھی رہنا اکتائے ہوئے رہنا

▲

بستی

بدلتے موسم کی رات
میدانوں میں اندھیرا
وہ سامنے اونچی کرسی کے مکانوں کی نیم روشنی میں
دروازوں کے باہر کھڑے
لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں؟
سیاست کی؟ محبت کی؟ جنگل کی؟
اشیائے صرف کی گرانی؟
گزرے ہوئے دنوں کی؟
آنے والے ماہ و سال کی؟
کچھ پتہ نہیں چلتا
بس دور سے ان کے ہونٹ ہلتے دکھائی دیتے ہیں۔

▲

سعادت حسن منٹو

وارث علوی

منٹو کے افسانوں کا مادی رجحان جنس ہے جسکے لئے اسے کافی مطعون کیا گیا ہے۔ اس موقع پر ازلی گناہ کا تو ذکر ہی بیکار ہے اجداد کے باغ میں اس شجر ممنوعہ کا نشو و نما ہے۔ جو پسند نہیں کرتے ان کی مخالفت کی بنیاد فکری گہرائی اور شعور کی پختگی کے بجائے ادب اور آرٹ کی پاکیزگی کے متعلق چند غلط قسم کے تصورات اور فرسودہ قدروں سے جذباتی وابستگی پر قائم ہے۔

.... منٹو نے ان کے مخالفانہ اور مخاصمانہ حملوں کی کوئی پرواہ نہیں کی مگر کوئی پختہ مغز اور باشعور نقاد اس کے افسانوں کا تجزیہ کرتا، اس کی خامیوں اور لغزشوں کی گرفت کرتا تو منٹو کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ خود ممتاز حسین کو اس بات کا اعتراف تھا کہ "منٹو اپنے عیوب جانتے ہیں بہت دلیر ہیں" منٹو کو غصہ تھا تو صرف اس بات کا کہ ادبی تنقید جو بہت ہی اہم فکری مشغلہ ہے۔ الزام تراشی، دشنام بازی اور جارحانہ حملوں کی شکل اختیار کر کے اپنے بلند مقام کو کھو بیٹھی تھی۔ تنقید کا فن ان لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا تھا جو اس کے اہل نہیں تھے۔ وہ کس قدر تلخی سے کہتا ہے "کسی ادب پارے کے متعلق روزانہ اخبار کے ایڈیٹر ایک اشتہار فراہم کرنے والے ممبر اور ایک سرکاری مترجم کا فیصلہ صائب نہیں ہو سکتا ...... کسی بڑے شاعر کسی بڑے افسانہ نگار پر صرف وہی آدمی تنقید کر سکتا ہے جو تنقید نگاری کے تمام عواقب و عواطف سے آگاہ ہو۔"

منٹو فنکار تھا۔ اسے ادب کی عظمت کا احساس تھا۔ فنکار کی ذمہ داری کا ثبوت تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسکے افسانے مخرب اخلاق یا فحش نہیں۔ وہ افسانے بچوں کیلئے اور تلذذ پسند نوجوانوں کیلئے نہیں لکھتا تھا خود عزیز احمد کو کسی زمانے میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ ترقی پسند ادب میں منٹو پر یہ سطریں بھی ملتی ہیں "اس قسم کے افسانوں کی سماجی نقطۂ نظر سے ایک ہی وجہ جواز ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ بچوں کو شروع سے جنسی تعلیم ملنی چاہئے لیکن اس خامی کو واضح کرنے کیلئے ایسے ترغیب انگیز انداز سے لکھنا جنکو پڑھ کر بھولے بھٹکے جنسی کو" اور مریضانہ نقطۂ نظر سے دیکھیں۔ انقلابی نقطۂ نظر سے ہرگز جائز نہیں" لیکن منٹو نے افسانے بچوں کیلئے نہیں لکھے، بچوں کیلئے علیحدہ ادب کی ضرورت ہے۔ یہ والدین کی دانشمندی نہیں کہ بچوں کے ہاتھ میں مادام بواری، ٹیرس کلہر، گرپنز یا آگ رکھدی جائے۔ منٹو کا مخاطب ان لوگوں سے بھی نہیں جو کتاب کو دل لگی یا جنسی تلذذ کی خاطر ہاتھ میں اٹھاتے ہیں۔ ان لوگوں کی ذہنی عیاشیوں کا سامان مہیا کرنے کیلئے بڑے بالوں اور افسردہ آنکھوں والے ادیب موجود ہیں جو بڑی تیز رفتاری سے گناہ کی راتوں میں اضافہ کر رہے ہیں۔ منٹو فنکار تھا، اسے ادب کی رفعتوں کا احساس تھا، اس کے صحیح مخاطب ذہین قارئین ہیں جو ادب کا سائنٹیفک طریقہ پر مطالعہ کرتے ہیں۔ ▲

افسانہ نگار اور جنسی مسائل

سعادت حسن منٹو

کوئی حقیر سے حقیر چیز بھی لیجئے، جو مسائل پیدا کرنے کا باعث ہو سکتی ہے۔ معدے کے اندر ایک پتھر گھس آئے تو اس کو باہر نکالنے اور آئندہ کیلئے دوسرے پتھروں کی روک تھام کرنے کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ یعنی تمام مسئلوں کا باپ اسوقت پیدا ہوا تھا جب آدم نے بھوک محسوس کی تھی اور اس سے بھی بڑا گمبھیر معاملہ اسوقت پردۂ ظہور میں آیا۔ جب دنیا کے اس سب سے پہلے مرد کی دنیا کی سب سے پہلی عورت سے ملاقات ہوئی تھی۔

یہ دونوں مسئلے جیسا کہ آپ جانتے ہیں مختلف دو قسم کی بھوکیں ہیں جن کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اسوقت جتنے معاشرتی، سیاسی اور جنگی مسائل نظر آتے ہیں ان کے عقب میں [illegible]

بھوک کسی قسم کی بھی ہو بہت خطرناک ہے۔ آزادی کے بھوکوں کو اگر غلامی کی [illegible] انقلاب ضرور برپا ہوگا۔ روٹی کے بھوکے اگر فاقے ہی کھینچتے رہے تو وہ تنگ آکر دوسرے [illegible] مرد کی نظروں کو اگر عورت کے دیدار کا بھوکا رکھا گیا تو شاید وہ اپنے ہم جنسوں اور حیو[illegible] کی کوشش کریں۔

دنیا میں جتنی لعنتیں ہیں بھوک ان کی ماں ہے۔ بھوک گداگری سکھاتی ہے، بھو[illegible] بھوک عصمت فروشی پر مجبور کرتی ہے۔ بھوک انتہا پسندی کا سبق دیتی ہے۔ اس کا حملہ بہت شدید، اس کا وار بہت اوچھا اور اسکا زخم بہت گہرا ہوتا ہے۔ بھوک دیوانے پیدا کرتی ہے، دیوانگی بھوک پیدا نہیں کرتی۔

دنیا کے کسی کونے کا مصنف ہو، ترقی پسند ہو یا تنزل پسند، بوڑھا ہو یا جوان، اس کے سامنے دنیا کے تمام بکھرے ہوئے مسائل رہتے ہیں۔ جن چن کر وہ ان پر لکھتا ہے۔ کبھی کسی کے حق میں اور کبھی کسی کے خلاف۔

آج کا ادیب بنیادی طور پر آج سے پانچسو سال پہلے کے ادیب سے کوئی زیادہ مختلف نہیں، ہر چیز پر نئے اور پرانے کا لیبل وقت لگاتا ہے، انسان نہیں لگاتا۔ ہم آج نئے ادیب کہلاتے ہیں۔ آنے والی کل ہمیں پرانا [illegible] اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم بیکار جئے۔ ہم نے مفت میں دوسروں کی گھڑی کی سوئی [illegible] ادیب کا بنیادی سبب بے مصرف نہیں ہو جاتا۔ پورا سفر طے کر کے سوئی پھر اکا نمبر کی طرف [illegible] یہی اصول ہے ادب و دنیا کا بھی ___

آج کے نئے مسائل بھی گذری ہوئی کل کے پرانے مسائل سے بنیادی طور پر مختلف نہیں۔ جو آج کی برائیاں ہیں گذری ہوئی کل ہی میں ان کے بیج بوئے گئے تھے۔ جنسی مسائل جسطرح آج کے نئے ادیبوں کے پیش نظر

پیش۔ اسی طرح پرانے ادیبوں کے پیشِ نظر بھی یہ تھے انھوں نے ان پر اپنے رنگ میں لکھا، ہم آج اپنے رنگ میں لکھ رہے ہیں۔

روٹی اور پیٹ، عورت اور مرد —— یہ دو بہت پرانے رشتے ہیں، ازلی اور ابدی —— روٹی زیادہ اہم ہے یا پیٹ —— عورت زیادہ ہے مزد رہا ہے کہ مرد —— میں اسکے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اسلئے کہ میرا پیٹ روٹی مانگتا ہے۔ لیکن یہ مجھے نہیں معلوم نہیں کہ گیہوں بھی میرے پیٹ کیلئے اتنا ہی ترستا ہے جتنا کہ میرا پیٹ! پھر بھی جب میں سوچتا ہوں کہ زمین نے گیہوں کے خوشوں کو بیکار جنم نہیں دیا ہوگا تو مجھے خوش فہمی ہوتی ہے کہ میرے پیٹ ہی کیلئے دسیع و عریض کھیتوں میں سنہری بالیاں جھومتی ہیں اور پھر ہو سکتا ہے کہ میرا پیٹ پہلے پیدا ہوا ہو اور گیہوں کی یہ بالیاں کچھ دیر بعد ——

کچھ بھی ہو لیکن یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ دنیا کا ادب صرف ان دو رشتوں ہی سے متعلق ہے۔ الہامی کتابیں جنکو آسمانی ادب کہنا چاہئے، روٹی اور پیٹ، عورت اور مرد کے تذکروں سے خالی نہیں۔

مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ مسائل اتنے پرانے ہیں کہ انکا ذکر الہامی کتابوں میں بھی آچکا ہے تو پھر کیوں آج کے ادیب ان پر خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ کیوں عورت اور مرد کے تعلقات بار بار کریدا جاتا ہے اور بقول شخصے عریانی پھیلائی جاتی ہے۔ جواب اس سوال کا یہ ہے کہ اگر ایک ہی بار جھوٹ نہ بولنے اور چوری نہ کرنے کی تلقین پر ساری دنیا جھوٹ اور چوری سے پرہیز کرتی تو شاید ایک ہی پیغمبر کافی ہوتا۔ لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں پیغمبروں کی فہرست خاصی لمبی ہے۔ ہم ایک ہی چیز کو ایک ہی مسئلے کو مختلف حالات میں مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں اور جو کچھ ہماری سمجھ میں آتا ہے دنیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور کبھی مجبور نہیں کرتے کہ وہ اسے قبول ہی کر لے۔

ہم قانون ساز نہیں، محتسب بھی نہیں، احتساب اور قانون سازی دوسروں کا کام ہے ہم حکومتوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں لیکن خود حاکم نہیں بنتے، ہم عمارتوں کے نقشے بناتے ہیں لیکن معمار نہیں۔ ہم مرض بتلاتے ہیں لیکن دواؤں کے مہتمم نہیں۔

ہم جنسیات پر نہیں لکھتے جو سمجھتے ہیں، جو سمجھتے ہیں کہ ہم ایسا نہیں کرتے ہیں۔ یہ ان کی غلطی ہے۔ ہم اپنے افسانوں میں خاص عورتوں اور خاص مردوں کے جنسی حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ہمارے کسی افسانے کی ہیروئن سے ایک مرد اگر صرف اسلئے متنفر ہو جاتا ہے کہ وہ سفید کپڑے پسند کرتی ہے اور سادگی پسند ہے تو دوسری کو اسے اصول نہیں سمجھ لینا چاہئے۔ یہ نفرت کیوں پیدا ہوئی اور کن حالات میں پیدا ہوئی، اس استفہام کا جواب آپ کو ہمارے افسانے میں ضرور مل جائیگا۔

جو لوگ ہمارے افسانوں میں لذت حاصل کرنے کیلئے دیکھنا چاہتے ہیں، یقیناً ناامیدی ہوگی۔ ہم داؤں پیچ بتلانے والے خلیفے نہیں، ہم جب اکھاڑے میں کسی کو گرتا دیکھتے ہیں تو اپنی سمجھ کے مطابق آپکو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، کہ وہ کیوں گرا تھا۔

ہم رجائی ہیں، دنیا کی سیاہیوں میں بھی ہم اجالے کی لکیریں دیکھ لیتے ہیں، ہم کسی کو حقارت کی نظر سے

نہیں دیکھتے۔ ہوٹلوں میں جب کوئی تخیلاتی اپنے کوٹھے پر سے کسی راہگزر پر پان کی پیک تھوکتی ہے تو ہم دوسرے تماشائیوں کی طرح نہ تو کبھی اس رہگذر پر ہنستے ہیں اور نہ کبھی اس تخیلاتی کو گالیاں دیتے ہیں۔ ہم یہ واقعہ دیکھ کر رک جائیں گے۔ ہماری نگاہیں اس غلیظ پیشہ ور عورت کے نیم عریاں لباس کو چیرتی ہوئی اسکے سیاہ عصیاں بھرے جسم کے اندر داخل ہو کر اسکے دل تک پہنچ جائے اس کو ٹٹولیں گی اور ٹٹولتے ٹٹولتے ہم خود کچھ عرصے کیلئے تصور میں وہی گریہ اور متعفن رنڈی بن جائینگے۔ صرف اسلئے کہ ہم اس واقعہ کی تصویر ہی نہیں بلکہ اس کے اصلی محرک کی وجہ بھی پیش کر سکیں۔

جب ہم کسی دلیشیا کو دیکھتے ہیں تو اس کی ہستی سے عورت کو نوچ کر علیحدہ نہیں کر دیتے۔ ہم بازاروں کے اندر بھی دیکھنے کے عادی ہیں۔

جب کسی اچھے خاندان کی جوان، صحت مند اور خوبصورت لڑکی کسی مریل، بدصورت اور قلاش لڑکے کے ساتھ بھاگ جاتی ہے تو ہم اسے ملعون قرار نہیں دینگے۔ دوسرے اس لڑکی کا ماضی، حال اور مستقبل اخلاق کی چھلنی میں نہ ڈالیں گے لیکن ہم وہ چھوٹی سی گرہ کھولنے کی کوشش کریں گے۔ جس نے اس لڑکے اور اس کو بے حس کیا۔

انسان ایک دوسرے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں یہ جو غلطی ایک مرد کرتا ہے دوسرا بھی کر سکتا ہے۔ جب ایک عورت بازار میں دکان لگا کر اپنا جسم بیچ سکتی ہے تو دنیا کی سب عورتیں ایسا کر سکتی ہیں لیکن نہیں جن کی کھیتوں میں انسان اپنی غلطیاں پیدا کرتا ہے اور ان کی فصلیں کاٹتا ہے۔

زیادہ تر جنسی مسائل ہی کیوں آج کے ادیبوں کا مرکز ہے اس کا جواب معلوم کرنا ہے۔ جدید نظریہ قدیم اضداد کا زمانہ ہے۔ عورت قریب بھی ہے اور دور بھی۔ لیکن کہیں مادر سے لیکر پیرتک کہیں عورت مرد کے بھیس میں دکھائی دیتی ہے کہیں مرد عورت کے بھیس میں۔

اگر ہماری تحریروں میں عورت اور مرد کے تعلقات کا ذکر آپ کو زیادہ نظر آئے تو یہ ایک فطری بات ہے، ملک کے سیاسی طور پر جدا کئے جا سکتے ہیں۔ ایک مذہب دوسرے مذہب سے عقیدوں کی بنا پر علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ دو زمینوں کو ایک قانون ایک دوسرے سے بیگانہ کر سکتا ہے لیکن کوئی سیاست کوئی عقیدہ، کوئی قانون، عورت اور مرد کو ایک دوسرے سے دور نہیں کر سکتا۔

عورت اور مرد میں جو فاصلہ ہے اسکو عبور کرنے کی کوشش ہر زمانہ میں ہوتی رہے گی، عورت اور مرد میں جو ایک لرزتی ہوئی دیوار حائل ہے اسے پھلانگنے اور گرانے کی کوشش، ہر صدی، ہر قرن میں ہوتی رہے گی۔ جو اسے عریانی سمجھتے ہیں انہیں اپنے احساس کے تئیں افسوس ہونا چاہیئے جو اخلاق کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اخلاق زنگ ہے جو سماج کے استرے پر جگہ جگہ جم گیا ہے۔

جو سمجھتے ہیں کہ نئے ادب نے جنسی مسائل پیدا کئے ہیں، غلطی پر ہیں۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ جنسی مسائل نے اس نئے ادب کو پیدا کیا ہے، اس نئے ادب کو جس میں آپ بھی کبھی اپنا ہی عکس دیکھتے ہیں اور جھنجھلا اٹھتے ہیں۔ حقیقت خواہ شکر ہی میں لپیٹ کر پیش کیجئے، اس کی کڑواہٹ دور نہیں ہو گی۔ ہماری تحریریں آپ کو کڑوی اور کسیلی لگتی ہیں مگر اب تک جو مٹھاس آپکو پیش کی جاتی رہی ہے اس سے انسانیت کو کیا فائدہ ہوا ہے ——؟ نیم کے پتے کڑوے سہی مگر خون ضرور صاف کرتے ہیں۔

سعادت حسن منٹو

—— اپنے افسانوں کے بارے میں منٹو نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "زمانے کے جس دور سے ہم اس وقت گذر رہے ہیں اگر آپ اس سے واقف نہیں تو میرے افسانے پڑھیئے، اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ زمانہ ناقابل برداشت ہے، میری تحریر میں کوئی نقص نہیں، جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ دراصل موجودہ نظام کا ایک نقص ہے۔" اس بیان کی صداقت کا اندازہ منٹو کے چند افسانوں سے لگا ہے جو کسی زمانے میں فسادات کو موضوع بنا کر لکھے گئے تھے، لیکن جو آج بھی ہماری تہذیب اور اس زمانے پر پورا اترتے ہیں۔ منٹو نے فسادات پر افسانے لکھے اور ان مسئلوں پر غور کرتا رہا تھا کہ اس خون خرابے اور شیطانی حرکت کی، جو لوگوں نے اس دوران میں کیں، آخر کیا وجہ ہے؟؟

آرام کی ضرورت

"مرا نہیں دیکھو ابھی جان باقی ہے"

"رہنے دو یار —— میں تھک گیا ہوں"

▲

دعوتِ عمل

آگ لگی تو سارا محلہ جل گیا۔ صرف ایک دکان بچ گئی۔ جس کی پیشانی پر یہ بورڈ آویزاں تھا

"یہاں عمارت سازی کا جملہ سامان ملتا ہے"

▲

ہمیشہ کی چھٹی

پکڑ لو —— پکڑ لو —— دیکھو جانے نہ پائے

شکار تھوڑی سی دوڑ دھوپ کے بعد پکڑ لیا گیا

جب نیزے اس کے آر پار ہونے کے لیے آگے بڑھے

تو اس نے لرزاں آواز میں گڑگڑا کر کہا ——

"مجھے نہ مارو —— مجھے نہ مارو ——

میں تعطیل میں اپنے گھر جا

پٹھانستان

"خو ایک دم جلدی بولو، تم کون ہو"

"میں ... میں ..."

"خو شیطان کا بچہ جلدی بولو —— اندو اے

یا مسلمین —— ؟"

"خو تمہارا رسول کون اے ... ؟"

"محمد خان"

"ٹھیک اے —— جاؤ" ——

سعادت حسن منٹو

اصلاح

"کون ہو تم؟"
"تم کون ہو؟"
"ہر ہر مہادیو ۔۔۔ ہر ہر مہادیو"
"ہر ہر مہادیو"
"ثبوت کیا ہے؟"
"ثبوت ۔۔۔ میرا نام دھرم چند ہے"
"یہ کوئی ثبوت نہیں"
"چاروں ویدوں میں سے کوئی بھی بات مجھ سے پوچھ لو"
"ہم ویدوں کو نہیں جانتے ۔۔ ثبوت دو"
"کیا"
"پاجامہ ڈھیلا کرو"
"پاجامہ ڈھیلا ہوا تو ایک شور مچ گیا "مار ڈالو ۔۔ مار ڈالو"
"ٹھہرو ٹھہرو ۔۔۔ میں تمہارا بھائی ہوں
بھگوان کی قسم تمہارا بھائی ہوں"
"تو یہ کیا سلسلہ ہے"
"جس علاقے سے آرہا ہوں وہ ہمارے دشمنوں کا تھا
اسلئے مجبوراً مجھے ایسا کرنا پڑا ۔۔۔ صرف اپنی
جان بچانے کیلئے ۔۔۔۔ ایک یہی چیز غلط ہو گئی ہے
باقی بالکل ٹھیک ہے"
"اڑا دو غلطی کو"
"غلطی اڑا دی گئی ۔۔ دھرم چند بھی ساتھ ہی اڑ گیا

کرامات

لوٹا ہوا مال برآمد کرنے کیلئے پولیس نے چھاپے
مارنے شروع کئے ۔
لوگ ڈر کے مارے لوٹا ہوا مال رات کے اندھیرے میں پھینکنے لگے
کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنا مال بھی موقعہ پا کر اپنے سے علیحدہ
کر دیا تاکہ قانونی گرفت
ایک آدمی کو
اس کے پاس شکر کی دو
کی دکان سے لوٹی تھیں
رات کے اندھیرے میں
آیا لیکن جب دوسری اٹھا کر اس میں ڈالنے لگا
تو خود بھی ساتھ چلا گیا ۔
شور سن کر لوگ اکٹھے ہو گئے ۔ کنوئیں میں رسیاں
ڈالی گئیں دو جوان نیچے اترے ۔ اور اس آدمی کو
باہر نکال لیا لیکن چند گھنٹوں کے بعد وہ مر گیا ۔
دوسرے دن جب لوگوں نے استعمال کیلئے اس
کنوئیں میں سے پانی نکالا تو وہ میٹھا تھا ۔
اس رات اس آدمی کی قبر پر دیئے جل رہے تھے ۔

▲

نئی غزل کا نمائندہ شاعر —— بانی

ڈاکٹر وحید اختر

میں سمجھتا ہوں بلا کسی مبالغے اور شخصی تعصب کے کہ اس وقت برصغیر میں جو چند شاعر غزل کے فن کو خلاقانہ انفرادیت کے ساتھ برتنے اور اسے نئی حیثیت میں ڈھالنے پر قادر ہیں۔ ان میں بانی کا نام یقیناً سرفہرست آسکتا ہے۔

بانی کی دو منفرد خصوصیات نے مجھے متوجہ کیا۔ ایک یہ کہ اس نے غزل کو نظمیت زدگی سے بچاتے ہوئے اس سے مسلسل فضا آفرینی اور خیال آفرینی کا کارِ مشکل پوری طرح لیا۔ فضا اور کیفیت آفرینی کی یہ خصوصیت جدید غزل میں سب سے پہلے ناصر کاظمی کے یہاں ملتی ہے لیکن بانی کے لہجے پر ان کا اثر نہیں اور یہ بڑی بات ہے۔ بانی کی غزلوں کی فضا بانی کی اپنی ہے جس پر کسی اور شاعر کی فضا کا عکس نہیں پڑتا۔ بظاہر بیانیہ انداز میں جو رمزیت بانی نے بکھیری ہے۔ اور لذتیت جسم SENSUALITY کو جس طرح حواس خمسہ کے وسیلے سے بانی نے مادی تجسیم کیفیت عطا کی ہے وہ اس کی غزلوں کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔

دوسری خصوصیت اس کے لہجے کی تہہ داری اور نیا پن ہے، اس ضمن میں ظفر اقبال کا خیال آتا ہے۔ ظفر اقبال کی نئی ابتدائی غزلوں میں غالب کے اثر کے باوجود انفرادیت اور معنی آفرینی کا جو امکان تھا اسے ان کے بعد کی شعبدہ بازیوں اور لسانی ہیرا پھیری نے غارت کر دیا۔ ظفر اقبال کی اس غیر تخلیقی شوقِ انفرادیت نے ہندوستان و پاکستان میں بہت اچھے غزل گویوں کے امکانات کو بھی ختم کر دیا لیکن بانی نے ان کے لہجے کا اثر قبول کرتے ہوئے جس طرح لہجے کی تخلیقیت اور لفظیت و تراکیب کی معنویت کو محفوظ رکھا وہی اس جہت میں غزل کی ترقی کا شاید واحد راستہ تھا۔ بانی نے جہاں جہاں نئی تراکیب یا اظہارات تراشے ہیں، وہ اکثر غزل کی فضا سے ہم آہنگ ہیں۔ اور ایک نادیدہ و نارسیدہ جہانِ معنی و احساس کی طرف لے جاتے ہیں مثلاً

وصال آہنگ، آسمان بھر، اڑان بھر، تشریحِ مسائل، سیر لباس، مختصر حرفِ بشارت کا دلستاں، نظارۂ اول کی خنک لو، لواحِ جاں، نشاطِ نغمہ، سبز صنوبر، سمت پسندی، حسن شروعِ گماں، لمحۂ کم مہرباں، شعلۂ زہر آب، چپ ذات، وصال لمحہ لمحہ، شب کدہ، ان میں بیشتر ترکیبیں الفاظ کی مزاج شناسی کی دین ہیں۔ شاید اسی لئے بانی کی ہندی آمیز ترکیبوں سے قطع نظر باقی اور ترکیبیں غالب کی یاد دلاتی ہیں، کہیں کہیں تو غالب بھی بانی کی گرفت میں آ کر چونکانے کی حد تک تازہ کار ہو گیا ہے۔

▲

بانی

غزل

صبح کی پہلی دعا سے آشنا ہوتا ہوا
ایک سناٹا ہے مانوس صدا ہوتا ہوا
جلتے موسم کی عجب تصویر ہے چاروں طرف
درمیاں اس کے ہے اک پتّہ ہرا ہوتا ہوا
اتنی آگاہی تو ہے میں راہ …
یہ نہیں معلو…
اک نوا آ…
ایک حرف صد…
دیکھ میں اپ…
دیکھ تیرا ہی نش…
اک نظر امکاں زار امکاں سفر کرتی ہوئی
ایک منظر سو برت یکسر نیا ہوتا ہوا
بڑھ رہا ہے کون اپنا راستہ لیتے ہوئے
مست ہم راہ چلے پیچھے خفا ہوتا ہوا

▲

غزل

ادھر آ اور ان خیموں کے اندر دیکھ
وہ سوئے ہوئے ہیں سکوں فردوس بستر دیکھ
انہی کے لب پہ شب کی حمد اول تھی
انہی کے تخت میں خوابوں کے دفتر دیکھ
عجب الجھی ہوئی آندھی چلی شب بھر
یہاں ٹوٹا نہیں کس شے کا محور دیکھ
فصیل شہر کے پتھر خلا میں تھے
مگر قائم رہی خیمے کی چادر دیکھ
اندھیرا اور اندھیرے میں بپا محشر
مگر ان کے سکوں کو تہِ محشر دیکھ
حصار حمد کے اندر پڑے سوئے
صفا و صدق کے بیٹوں کے لشکر دیکھ
ہلاکت خیزیوں کے درمیاں بانی
ابھرتی صبح کا محفوظ منظر دیکھ

▲

نئی غزل کا نمائندہ شاعر ——— بانی

ڈاکٹر وحید اختر

میں سمجھتا ہوں بلا کسی مبالغے اور تشخصی امر کے کہ اس وقت برصغیر میں جو چند شاعر غزل کے فن کو خلاقانہ انفرادیت کے ساتھ برتنے اور اسے نئی حیثیت میں ڈھالنے پر قادر ہیں۔ اُن میں بانی کا نام یقیناً سرِفہرست آسکتا ہے۔

بانی کی دو منفرد خصوصیات نے مجھے متوجہ کیا۔ ایک یہ کہ اس نے غزل کو نظمیت زندگی سے بچاتے ہوئے اس سے مسلسل فضا آفرینی اور خیال آفرینی کا کام پوری طرح لیا۔ فضا اور کیفیت آفرینی کی یہ خصوصیت جدید غزل میں سب سے پہلے ناصر کاظمی کے یہاں ملتی ہے لیکن بانی کے لہجے پر ان کا اثر نہیں اور یہ بڑی بات ہے۔ بانی کی غزلوں کی فضا بانی کی اپنی ہے جس پر کسی اور شاعر کی فضا کا عکس نہیں پڑتا۔ بظاہر بیانیہ انداز میں جو رمزیت بانی نے رکھ دی ہے۔ اور لذتیت جسم SENSUALITY کو جس طرح حواس خمسہ کے وسیلے سے بانی نے نادر تجسیم کیفیت عطا کی ہے وہ اس کی غزلوں کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔

دوسری خصوصیت اس کے لہجے کی تہہ داری اور نیا پن ہے، اس ضمن میں ظفر اقبال کا خیال آتا ہے۔ ظفر اقبال کی نئی ابتدائی غزلوں میں غالب کے اثر کے باوجود انفرادیت اور معنی آفرینی کا جو امکان تھا اسے انکے بعد کی شعبدہ بازیوں اور لسانی ہیرا پھیری نے غارت کر دیا۔ ظفر اقبال کی اس غیر تخلیقی شوقِ انفرادیت نے ہندوستان و پاکستان میں بہت اچھے غزل گویوں کے امکانات کو بھی ختم کر دیا لیکن بانی نے انکے لہجے کا اثر قبول کرتے ہوئے جس طرح لہجے کی تخلیقیت اور نئی لفظیات و تراکیب کی معنویت کو محفوظ رکھا وہی اس جہت میں غزل کی ترقی کا شاید واحد راستہ تھا۔ بانی نے جہاں جہاں نئی تراکیب یا اظہارات تراشے ہیں، وہ اکثر غزل کی فضا سے ہم آہنگ ہیں۔ اور ایک نادیدہ و نارسیدہ جہانِ معنی و احساس کی طرف لے جاتے ہیں مثلاً

وصال آہنگ، آسمان بھر، اسان بھر، تشریحِ نائل، سیر لباس مختصر، حرفِ بشارت کا دلستاں، نظارۂ اول کی خنک بو، لوازِ جاں، نشاطِ نغمہ، سرِ بحرِ منور، سمت پسندی، حسن شروعِ گماں، لمحۂ کم مہرباں، شعلۂ زہر آب، جیبِ ذات، وصال لمحہ لمحہ، شب کدہ، ان میں بیشتر ترکیبیں الفاظ کی مزاج شناسی کی دین ہیں۔ شاید اسی لئے بانی کی ہندی آمیز ترکیبوں سے قطع نظر بانی اور ترکیبیں غالب کی یاد دلاتی ہیں، کہیں کہیں تو غالب بھی بانی کی گرفت میں آکر چونکانے کی حد تک تازہ کار ہو گیا ہے۔

▲

باقی ۲۳

غزل

ادھر آ اور ان خیموں کے اندر دیکھ
وہ سوئے ہوئے ہیں سکوں فردوس بستر دیکھ
انہی کے لب پہ شب کی حمد اول تھی
انہی کے تخت میں خوابوں کے دفتر دیکھ
عجب الجھی ہوئی آندھی چلی شب بھر
یہاں ٹوٹا نہیں کس شے کا محور دیکھ
فصیل شہر کے پتھر خلاء میں تھے
مگر قائم رہی خیمے کی چادر دیکھ
اندھیرا اور اندھیرے میں بپا محشر
مگر ان کے سکوں کو ردِّ محشر دیکھ
حصار حمد کے اندر پڑے سوئے
صفا و صدق کے بیٹوں کے لشکر دیکھ
ہلاکت خیزیوں کے درمیاں باقی
ابھرتی صبح کا محفوظ منظر دیکھ

غزل

صبح کی پہلی دعا سے آشنا ہوتا ہوا
ایک سناٹا ہے مانوس صدا ہوتا ہوا
جلتے موسم کی عجب تصویر ہے چاروں طرف
درمیاں اس کے ہے اک پتہ ہرا ہوتا ہوا
اتنی آگاہی تو ہے میں بڑھ رہا ہوں کس طرف
یہ نہیں معلوم کس سے ہوں جدا ہوتا ہوا
اک نوا آہستہ آہستہ فنا ہوتی ہوئی
ایک حرف مدعا چپ چپ ادا ہوتا ہوا
دیکھ میں اپنی جگہ سے اک قدم سرکا نہیں
دیکھ تیرا ہی نشانہ ہے خطا ہوتا ہوا
اک نظر، امکاں زا امکاں، سفر کرتی ہوئی
ایک منظر، سوبسو، یکسر نیا ہوتا ہوا
بڑھ رہا ہے کون اپنا راستہ لیتے ہوئے
مست ہم پہلے سے پیچھے خفا ہوتا ہوا

غزل

علی بن متقی رویا
وہی چپ تھا وہی رویا
عجب آشوبِ عرفاں میں
فضا گم تھی کہ جی رویا
یقیں مسمار موسم کا
کھنڈر خود سے تہی رویا
اذاں زینہ اتر آئی
سکوتِ باطنی رویا
خلا ہر ذات کے اندر
سُنا جس نے وہی رویا
ندی پانی بہت روئی
عقیدہ روشنی رویا
سحر دم کون روتا ہے
علی بن متقی رویا

▲

غزل

عجب تجربہ تھا بھنور سے گزرنے کا
اسے بہانہ ملا مجھ سے بات کرنے کا
پھر ایک موج اسے کھینچ لے گئی تہہ آب
تماشہ ختم ہوا ڈوبنے ابھرنے کا
مجھے خبر ہے کہ رستہ مزار چاہتا ہے
میں خستہ پا سہی لیکن نہیں ٹھہرنے کا
تھما کے ایک بکھرتا گلاب میرے ہاتھ
تماشا دیکھ رہا ہے وہ میرے ڈرنے کا
یہ آسماں میں سیاہی بکھیر دی کس نے
تھا ہمیں شوق بہت اس میں رنگ بھرنے کا
بس ایک چیخ گری تھی پہاڑ سے یک لخت
عجب نظارہ تھا پھر دھند کے بکھرنے کا

▲

انتظار حسین

محمد سلیم الرحمٰن

انتظار حسین کے نئے افسانے کا غالب مقصد ہمارے عہد کی سیاسی المیے کی فکر، وقت کے لگائے ہوئے زخموں کا احساس اور ان کا منطقی انجام ــــ عام لبستی اور قدروں کا انہدام، ہماری قوتوں کا انتشار ساتویں دہائی اور آٹھویں دہائی کے آغاز سے بہت کچھ ملتا ہے جیسے انیسویں صدی کا کاروان ہے۔ اور اس کے ذہنی آتش دان کو روشن رکھتا ہے۔ ایوب راج کے خلاف بے اطمینانی کا ابال ۱۹۶۵ء کی جنگ کا دل خراش انجام مشرقی پاکستان میں بھیانک خون ریزی اور ان سب پر طرہ ــــ دسمبر ۱۹۷۱ء کی فوجی ہار [illegible]

یہ سب زہر میں بجھے ہوئے تیر ہیں جو اس کے الم انگیز اور خوں فشاں فن کے جسم میں پیوست ہیں۔ گھٹن ہی گھٹن ہے کہیں روزن ہے نہ دریچہ۔ خوابوں اور خوش فہمیوں کو پناہ گاہ بنانے والے پرانے درختوں کی طرح کاٹ کاٹ دیئے جاتے ہیں۔ جلا کر ڈھیر کر دیئے جاتے ہیں۔

یہ وہ صورت حال ہے جو تازہ ترین کہانیوں میں فضا نظر آتی ہے "وہ جو کھو گئے" جس میں [illegible] ملا جلا ہے، شہر افسوس جس میں ایک طوفان بپا ہے۔ ان افسانوں میں کردار اپنے نام [illegible] بیٹھے ہیں۔ ایک [illegible] جہاں نفسا نفسی کا عالم ہے جہاں ہر شخص جان کی امان مانگتا ہے اور بھاگتا ہے۔ [illegible] میں ایک ایسے [illegible] میں گرفتار ہے جس کا کوئی درماں نہیں، پوری فضا میں باہمی بے اعتمادی اور بے سمتی کی [illegible] ہے۔ توازن کا سارا [illegible] زمان و مکان کا سارا احساس ریزہ ریزہ ہے اب ذہن [illegible] ہتھیں بھی نہیں جیسے کا مستقبل بھی نہیں اور آخر میں ایسا لگتا ہے کہ فضا میں تمسخر کے سوا کچھ بچا نہیں۔ یہ بے نام لوگ جن کے چہرے مسخ ہیں۔ خاک و خون ہو رہے ہیں۔ [illegible] ہیں۔ تاریخ کے تاریک کونوں میں فنا ہو رہے ہیں۔

[illegible] اس بات کی تعقیب ہیں کہ [illegible] اور تباہی کا سیلاب اور بڑھے گا۔ فرار [illegible] کے راستے سب بند ہیں [illegible] اور دہشت کی زندگی ـــ یہ جینا بھی کوئی جینا ہے۔ مگر لگتا ہے جینے کی [illegible] جا رہا ہے۔

انتظار کے افسانے میں قیامت آ چکی ہے۔ اب کیا ہوگا؟ کیا اب آسمان [illegible] کے گالوں کی طرح [illegible] لے گا۔ پہاڑ سرمہ بن جائیں گے۔ گندھک کے چشمے ابل پڑیں گے کیا سب کچھ [illegible] [illegible] ق ہو جائیگا۔

غزل

علی بن متقی رویا
وہی چپ تھا وہی رویا
عجب آشوب عرفاں میں
فضا گم تھی کہ جی رویا
یقیں مسمار موسم کا
کھنڈر خود سے تہی رویا
اذاں زینہ اتر آئی
سکوت باطنی رویا
خلا ہر ذات کے اندر
سنا جس نے وہی رویا
ندی پانی بہت روئی
عقیدہ روشنی رویا
سحر دم کون روتا ہے
علی بن متقی رویا

▲

غزل

عجب تجربہ تھا بھنور سے گزرنے کا
اسے بہانہ ملا مجھ سے بات کرنے کا
پھر ایک موج اسے کھینچ لے گئی تہہ آب
تماشہ ختم ہوا ڈوبنے ابھرنے کا
مجھے خبر ہے کہ رستہ مزار چاہتا ہے
میں خستہ پا سہی لیکن نہیں ٹھہرنے کا
تھما کے ایک بکھرتا گلاب میرے ہاتھ
تماشا دیکھ رہا ہے وہ میرے ڈرنے کا
یہ آسماں میں سیاہی بکھیر دی کس نے
ہمیں تھا شوق بہت اس میں رنگ بھرنے کا
بس ایک چیخ گری تھی پہاڑ سے یک لخت
عجب نظارہ تھا پھر دھند کے بکھرنے کا

▲

انتظار حسین

محمد سلیم الرحمٰن

انتظار حسین کے افسانے کا غالب موضوع ہمارے عہد کی سیاسی المیے کی فکر، وقت کے لگائے ہوئے زخموں کا احساس اور ان کا منطقی انجام ـــ عام پستی اور قدروں کا ابتذال، ہماری قوتوں کا انتشار ساتویں دہائی اور آٹھویں دہائی کے آغاز سے بہت کچھ ملتا ہے جو انتظار حسین کا کہانی کار ہے۔ اور اس کے ذہنی آتش دان کو روشن رکھتا ہے۔ ایوب راج کے خلاف بے اطمینانی کا ابال، ۱۹۶۵ء کی جنگ کا دل خراش انجام مشرقی پاکستان میں بھیانک خون ریزی اور ان سب پر طرہ ـــ دسمبر ۱۹۷۱ء کی فوجی ہار، جی یہ سب زہر میں بجھے ہوئے تیر ہیں جو اس کے المناک اور خوں فشاں فن کے جسم میں پیوست ہیں۔ گھٹن ہی گھٹن ہے کہیں روزن ہے نہ دریچہ۔ خوابوں اور خوش فہمیوں کو پناہ گاہ بنانے والے، پرانے درختوں کی طرح کاٹ کاٹ دیئے جاتے ہیں۔ جلا کر ڈھیر کر دیئے جاتے ہیں۔

یہ وہ صورت حال ہے جو تازہ ترین کہانیوں میں نظر آتی ہے، "وہ جو کھو گئے" جس میں کلی تلاطم ہے، "شہر افسوس" جس میں ایک طوفان بپا ہے۔ ان افسانوں میں کردار اپنے نام تک کھو بیٹھے ہیں۔ ایک بھیانک ہیجان نفسا نفسی کا عالم ہے جہاں ہر شخص جان کی اماں مانگتا ہے اور بھاگتا ہے۔ ہر شخص ایک ایسے ڈر میں گرفتار ہے جس کا کوئی درماں نہیں، پوری فضا میں یاس ہے، بے اعتمادی اور بے سمتی کا راج دورہ ہے۔ توازن کا سارا احساس، زمان و مکان کا سارا احساس ریزہ ریزہ ہے اب زندہ رہنے کی آرزو ہوتی بھی نہیں جینے کا سلیقہ ہیجان بھی نہیں اور آخر میں ایسا لگتا ہے کہ فضا میں مسیح کے سوا کچھ بچا نہیں۔ بے نام لوگ جن کے چہرے مسخ ہیں۔ خاک و خون ہو رہے ہیں۔ ترقیاتی ... ہیں ... تاریخ کے تاریک کونوں میں فنا ہو رہے ہیں۔

یہ بلند حسین اس بات کی نقیب ہیں کہ بدی اور تباہی کا سیلاب اور بڑھے گا۔ فرار اور ... کے راستے سب بند ہیں ہذیان و دہشت کی زندگی۔ یہ جینا بھی کوئی جینا ہے۔ مگر لگتا ہے جینے کا حق ادا ... کیا جا رہا ہے۔

انتظار کے افسانے میں قیامت آ چکی ہے۔ اب کیا ہوگا؟ کیا اب آسمان ... کے گالوں کی طرح اڑے گا۔ پہاڑ سرمہ بن جائیں گے۔ گندھک کے چشمے ابل پڑیں گے کیا سب کچھ ... فنا ہو جائیگا۔

انتظار حسین

افسانہ

نیند

ظفر اسے دیکھ کر حیران رہ گیا "ارے سلمان تم! تم آگئے؟ مگر کیسے؟"

"یہ مت پوچھو کیسے۔ بس میں آگیا"

ظفر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آگے کیا کہے۔ وہاں سے زندہ بچ کر نکل آنا ــــ "یہ تو معجزہ ہے۔"

"ہاں معجزہ ہی سمجھو۔ بس زندگی تھی کہ نکل آیا"

تعجب اسکے نکل آنے پر ظفر ہی کو نہیں تھا خود اسے بھی تھا

"میں خود حیران ہوں کہ وہاں سے میں کیسے نکل آیا"

ظفر حیرانی سے اسے تکتا رہا۔ وہاں سے بچ کر نکل آنے والوں میں وہ پہلا شخص تھا جس سے ظفر کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے تصور میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ وہاں سے کوئی بچ کر کیسے آ سکتا ہے۔ اس نے سلمان کو ایک مرتبہ نظر بھر کر سر سے پیر تک دیکھا "سلمان تم وہاں سے نکلے کیسے؟"

"میں کیسے نکلا"؟ وہ بڑبڑایا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ایک سانس میں اپنی پوری روداد سنا ڈالے مگر پھر اردگرد کی فضا دیکھ کر رکا "یار دو لفظوں میں تو نہ بیان کیا نہیں جا سکتا۔ یہ تو پوری داستان ہے، تم سنو گے تو تمہارے ہوش اڑ جائیں گے"

"ٹھیک کہتے ہو۔ ہمارے تو سن سن کر ہوش اڑے جاتے ہیں اور تم نے تو سب کچھ آنکھوں سے دیکھا ہے"۔

"ہاں سب کچھ آنکھوں سے دیکھا ہے" اذیت بھرے ان گنت منظر اسکی آنکھوں میں گھوم گئے "اتنا کچھ دیکھا ہے کہ... بس بہت کچھ دیکھا ہے"

"پھر سناؤ"۔

ایک دفعہ پھر اس کا جی چاہا کہ بس شروع ہو جائے لیکن اس نے پھر اپنے آپ کو روکا "سنانے کیلئے میرے پاس بہت کچھ ہے مگر یہاں کھڑے کھڑے کیا سناؤں"

"کیا شام کیا صبح، میرے لئے کرنے کو اب ہے کیا"؟

"تو پھر شام کو میری طرف آ جاؤ"

"آ جاؤں گا"

"اسلم کو فون کروں گا۔ وہ بھی آ جائے گا"

"اسلم جعفری؟ ارے وہ یہیں ہے"

"اسے رزق نے موت، اسے کہاں جانا ہے"

"اور زیدی کہاں ہے؟"

"اچھا اس بھوا سے کو بھی بلا لوں گا۔ پھر محفل ہی سجی"

"ظفر نے گھر پہنچ کر تیزی سے ڈائل گھمایا "ہیلو اسلم" یار میں ہوں ظفر" یار سلمان آگیا ہے"

"سلمان؟ ــــ یار کیا کہہ رہا ہے؟"

"ہاں ہاں یار، وہ آگیا ہے"

"وہ وہاں سے بچ کر نکل آیا؟ مگر کیسے؟"

"شام کو آؤ اور اس سے خود پوچھو"

"آؤں گا"

پھر اس نے زیدی کے دفتر فون کیا "ہیلو زیدی... بھئی زیدی صاحب کو بلائیں... ہیلو زیدی۔ یار تمہیں ایک خبر سناؤں سلمان آگیا ہے"

"سلمان....؟ نہیں ہے"

"ہاں یار وہ نکل آیا ہے"

بہت موٹی کہاں کا نکلا - پھر کہاں ہے وہ"
شام کو میری طرف آجاؤ .... وہ آئے گا"
آجاؤں گا"
شام کو چاروں یار اکٹھا ہوئے - تینوں نے
ان کو اور سلمان نے ان تینوں کو ایک حیرت سے دیکھا
نے اسکے بیچ آجانے پر پہلے تعجب کا اظہار کیا - پھر وہاں کے
ات پر اظہار افسوس کیا - پھر اسے غصہ آتا چلا گیا"
وں کو انھوں نے کیسی کیسی اذیتیں دے کر مار رہے، بوڑھو
بچوں کو، عورتوں کو "وحشی ..... درندے میرا بس
تو میں نہیں .... " اس نے دانت کچکچائے -
نہیں یہی کرنا چاہئے تھا" زیدی نے اعلان کیا
کرنا چاہئے تھا" اسلم نے لال پیلی نظروں سے زیدی کو دیکھا
بیس سال تک انکے ساتھ جو کچھ کرتے رہے تھے اس کے
نہیں یہی کرنا چاہئے تھا"
کرتے رہے تھے" کیا کیا تھا ہم نے انکے ساتھ" اسلم
بے چلّایا - پھر اسلم نے اخباری رپورٹوں کے حوالے
کے مظالم کی تفصیلات سنائیں اور زیدی نے بے تحاشہ
دشمار بیان کر کے اپنی طرف سے استحصال کا رونا رو کر تاب
ایک لمبی جماہی لی - ظفر نے اسکی طرف دیکھا - "سلمان
کیا خیال ہے تم بتاؤ - "
نے ظفر کے منہ کی بات لپک لی " ہاں سلمان سے پوچھو
ہاں اتنے عرصہ رہا ہے - اس نے سارے حالات دیکھے ہیں
تمہارا کیا خیال ہے - ؟
خیال ہے " وہ سوچ میں پڑ گیا -
موش دیکھ کر ظفر بے چین ہوا
وش دیکھ کر ظفر بے چین ہوا " یار کچھ بولو
ہاں ! " وہ بے دلی سے بولا "
ظفر یہ ہنسی ہنسا " کمبخت منہ سے ڈرتا ہے"

" کمبخت " وہ زیدی کا منہ تکنے لگا
اسلم نے زور دے کر کہا " آخر یہ تو چلے کہ تم اس بارے میں کیا سوچتے ہو
اس نے ایک تذبذب کیسا تھ کہا " یار کچھ سمجھ میں نہیں آتا"
ظفر نے برہمی سے اسے دیکھا " پچھلے برس تم آئے تھے تو تم نے وہاں کے
حالات کا تجزیہ کر کے میرا دماغ چاٹ لیا تھا - "
" اچھا چھوڑو اس قصے کو " ظفر نے کہا " تم یہ بتاؤ کہ وہاں ہو کیا
ہاں میں بتا سکتا ہوں " اس نے مستعدی سے کہا " میں نے وہاں
بہت کچھ دیکھا ہے میں اسے سناؤں تو تمہارے رونگٹے کھڑے
ہو جائیں گے " وہ یہ کہہ کر ایسے چپ ہوا جیسے کوئی لمبی
داستان سنانے کی تیاری کر رہا ہو -
تینوں یار ہمہ تن گوش ہو بیٹھے - انتظار کرتے رہے کہ اب
شروع اور اب شروع ہو - مگر وہ بالکل چپ تھا جب وہ کچھ
نہ بولا تو ظفر نے ٹھوکا " یار تم تو پھر چپ ہو گئے " -
" ہاں یار " اس نے سناٹے لہجہ میں کہا " کچھ یاد نہیں آرہا"
اسلم اور زیدی دونوں نے اسے غصیلی نظروں سے
دیکھا اور پھر اس سے بے تعلق ہو کر ایک دوسرے سے بحث کرنے لگے
بحث گرم ہوتی چلی گئی طنز و تعریض، غصہ، ناشائستہ
کلمے کبھی ادھر سے کبھی ادھر سے بیچ بیچ میں ظفر کی طرف سے
کوئی بھرپور گالی - کبھی اس طرف والوں کیلئے کبھی اس طرف
والوں کیلئے - وہ دوستوں کا منہ تکتا رہا - پھر اس کے پپوٹے
بھاری ہونے لگے - ایک دو دفعہ اونگھ گیا - پھر فوراً ہی مستعد
ہو بیٹھا اور ایک ایک بات غور سے سننے لگا - مگر تھوڑی ہی
دیر میں اسکے پپوٹے پھر بھاری ہونے اور اس کی آنکھیں
مندتی چلی گئیں -
اس نے بیچ میں ایک بار چونک کر آنکھیں کھولیں
" دہشت گرد - غدار - ہندوستان کے ایجنٹ - "
اس نے دونوں کو نیند بھری آنکھوں سے دیکھا اور پھر سو گیا -
آخر اس وقت اٹھا جب چائے آگئی اور ظفر نے اسے ٹھوکا -

"سلمان چلئے ہو"

اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ معذرت طلب نظروں سے دوستوں کو دیکھا اور مسکرا کر بیٹھا۔ آنکھوں یہ انگلیاں پھیریں پھر چائے کا گھونٹ لیا۔ چائے کے ساتھ اس کی نیند غائب ہو گئی۔ چائے نے اسے تازہ دم کر دیا تھا اور جیسے اسکے حافظے کے دریچے کھلتے جا رہے ہوں۔

"اپنے سونے پران دنوں کا ایک واقعہ یاد آ گیا اس رات ایسا ہوا کہ میں بالکل نہیں سو سکا"

یہ کہتے کہتے کئی دہشت بھرے منظر تیزی سے اس کے تصور میں ابھرے اور ایک غیر انسانی سی چیخ اس کے دماغ میں گونج گئی۔ "یہ کس رات کا ذکر ہے" زوال ہو چکا تھا لیے اسلم نے سوال کیا۔

اس نے پھر سوچا پھر کہا یاد نہیں وہ کون سی رات تھی وہ سب راتیں ایک ہی سی تھیں۔۔ ہوا یہ کہ ....

یہ کہتے کہتے وہ چپ ہو گیا۔

اسلم، زیدی، ظفر تینوں اس کی طرف متوجہ تھے انہیں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ سٹپٹایا، بولا "آئی بات ذہن سے اتر گئی۔ بہر حال اس کے بعد میں رات بھر نہ سو سکا" سکا پھر بولا"۔ اور پھر اس کے بعد تو یہ ہوا کہ سونا نصیب ہی نہیں ہوا شاید پھر سویا ہی نہیں ......

یا شاید کبھی سو لیا ہوں "۔ وہ الجھ سا گیا اور چپ ہو گیا۔

اسلم، زیدی، ظفر تینوں نے بے دلی سے اس کی بات سنی پھر وہ آپس میں گتھ گئے اور وہی بحث کرنے لگے کہ ادھر والوں نے ان کا استحصال کیا یا ادھر والوں نے غداری کی۔ اور وہ بیٹھا بیٹھا یہ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ ان راتوں میں وہ کسی رات سویا تھا یا نہیں سویا تھا۔ اسے کچھ یاد نہ آیا۔ تھک کر اس نے وہاں کا خیال چھوڑا اور یہاں آنے کے بعد! یہاں کے بعد سونے کا حساب وہ ٹھیک نہیں لگا سکا

اس حساب سے تھک کر وہ اسلم، زیدی اور ظفر کی بحث پر متوجہ ہو کر سنتا رہا، سنتا رہا، سنتے سنتے اس نے ایک لمبی جماہی لی اور غنودہ آمیز آنکھ سے ظفر کو دیکھتے ہوئے کہا "یار مجھے نیند آ رہی" ظفر نے مڑ کر اسے دیکھا پھر مڑ کر کہا "تو پھر سو" "ہاں یار میں سونا چاہتا ہوں" بند ہوتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بھری آواز میں یہ کہتے کہتے وہ آگے کھسکا، سر صوفے کی پشت پر ٹکایا اور پیر میز پر پھیلائے۔ اس طرح کہ اس کی ایک جوتی اسلم کے مقابل تھی اور دوسری جوتی کی نوک زیدی کی ... اور خراٹے لینے لگا۔

خوش طبیعت اور پر وقار نظر آنے کے لئے

کپڑے عمدہ سلوائیں

شوبھا ٹیلرس

آپ اپنی تشفی کیلئے صرف ایکبار تشریف لائیں۔

شوبھا ٹیلرس

جی۔ سی۔ ستارا روڈ اسلام پور

صادق

کمار پاشی

نئی ہوشمندی کے فروغ سے قبل کی نسل کو میں خوش قسمت کہونگا کہ اسکے راستے میں حائل ہونے والے ادیب شاعر ان سے کہیں زیادہ باصلاحیت اور انکی طرح تقلیدی نہیں بلکہ تخلیقی ذہن رکھتے تھے اور اسکے ساتھ ہی انہیں اپنے ماضی کی کبھی نہ مرنے والی تہذیبی، سماجی، اخلاقی اور معاشرتی اقدار بھی عزیز تھیں اور یہی وجہ ہے کہ انکے لئے زندہ روایات کی بحالی اور انکی بنیادوں پر نئی اقدار کی تشکیل کے راستے میں کسی قسم کی غیر ادبی اور غیر تخلیقی رکاوٹ ناقابل تصور تھیں۔ اردو شعر و ادب کے راستے روشن اور واضح بنانے والی یہ جدید نسل جو چھٹی دہائی کے آغاز ہی سے اپنی علیحدہ شناخت کا ثبوت فراہم کر چکی ہے اور جس نے منصوبہ بند موضوعات کی تشہیر کرنے والی غیر تخلیقی اور غیر ادبی لوگوں کے مردہ، لڑکھڑاتے بنجر دلوں پر اپنے ٹھوس قدم جماکر اپنے موجود کا احساس دلانے میں عظیم الشان کامیابی حاصل کی ہے اس اعتبار سے آج نامراد سمجھی جانے لگی ہے۔ کہ اسکے بعد آنیوالے نقالوں کے جسموں میں تو اتنا خون بھی نہیں ہے جس سے وہ اپنے چہرے صاف کرکے اگر اپنا نہیں تو اپنے خالق کی پہچان کا دھندلا سا عکس فراہم کرسکیں۔ کسی بھی زبان و ادب کیلئے یہ صورت حال بڑی افسوسناک ہے۔ بڑے بڑے نقالوں کے اس ہجوم میں چند ناموں نے سنجیدہ ادبی حلقوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے ان میں صادق کا نام بہت اہم ہے۔

ہر پل بدلتے ہوئے اس بے شناخت دور میں جب ہم گمشدہ تہذیبی، اخلاقی اور معاشرتی اقدار کے پس منظر میں اپنی پہچان کا اظہار کرینگے تو اردو شاعری کی مروجہ زبان یقیناً ہمارے تخلیقی اظہار میں حائل ہوگی صادق نے اس گھٹن سے چھٹکارا پانے اور قدرے کھلی ہوا میں سانس لینے کیلئے اپنی شاعری میں سنسکرت، ہندی کے الفاظ کا استعمال اس خوبصورتی اور اس فنکارانہ انداز میں کیا ہے کہ انہیں ہم اپنے مزاج میں بے حد ہم آہنگ پاتے ہیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ بعض لوگ جو کسی تعصب کا شکار ہیں اس سلسلہ میں کیا کہیں گے لیکن اردو شاعری کو سطحی غزلیہ بیان سے چھٹکارہ دلانے کیلئے صادق کی کوشش قابل داد ہے۔

▲

صادق

○ غزل

جس دن پڑوسیوں نے مرا گھر جلا دیا
ایک دیوتا سا تھا مرے اندر جلا دیا

تم کو ملال دل کا ہمارے فضول ہے
اسکے بدن کی آنچ نے پتھر جلا دیا

کل شب کو تجھ دماغ میں کیسا فتور تھا
تنہائیوں کے خوف سے بستر جلا دیا

ہر شخص پانیوں کی طرف دوڑتا گیا
تھی اتنی تیز آگ کہ بھیتر جلا دیا

اس بات کا ہمیں کوئی وہم و گمان نہ تھا
ندیوں کی آگ نے تو سمندر جلا دیا

▲

غزل

میں پرتھوی الانگھ کے تیری پکار پر
پھر آ کھڑا ہوا ہوں سفر کی کگار پر

وعدے پہ تیرے گرد کی تہہ سی جمی ہوئی
جالے تنے ہوئے ہیں مرے انتظار پر

ہے دستکوں پہ آنکھ تو پاؤں رکاب پر
پر میرا بس نہیں ہے ترے اختیار پر

وہ سوگوار جھوٹی تسلی پہ خوش ہوا
بھرپور وار غم نے کیا غمگسار پر

اپنی بلندیوں کی پتا کا ذرا سنبھال
پتھر ہوس کے پھینک نہ کچے انار پر

▲

غزل

لوگ جب اپنے تجربے سنتے
مجھ سے خوش ہوتے اور سر دھنتے

ایک چہرہ جو آنکھ میں گھستا
رابطے بے شمار جل بجھتے

تم تو متروک ابتدا لائے
ہم سرابوں کے سلسلے بنتے

[illegible] دتا نہیں تو آنکھوں کے
دور اشکوں کی چاپ کیوں سنتے

زد سے مفہوم کی نکل جاتے
جب بھی الفاظ کے گہر چنتے

▲

وگندر پال ۳۱

برابری، شرافت وغیرہ وغیرہ

شامو جیبیں کترتا، رامو چوری کرتا اور چنبیلی عزت بیچتی اور دن رات کی محنت
ے بعد وہ بڑی مشکل سے صرف اتنا ہی کماتے کہ پیٹ بھر کھانا یا کھانے کے نام پر جو کچھ بھی مل سکے مل جائے۔

وہ تینوں اکٹھے ہی رہا کرتے تھے، جب کوئی گاہک پھنس جاتا تو چنبیلی بن ٹھن کر وہ وقت
ے ساتھ بتا دیتی۔ نہیں تو لیٹے بیٹھے باری باری شامو اور رامو کی لگائی بن جاتی اور ان دونوں میں سے جس کی بھی
لا ہوتی وہ اپنے کام کاج پر دھیان کی بجائے دن رات گھری پر پڑا رہتا۔ گھر کا مال و متاع سے بھرا پڑا ہو تو کہیں
یو بھک ماری جائے یہیں کہیں نہ نقب لگائی جائے یا قینچی چلائی جائے۔

"شب بخیر چور رامو" پتہ نہیں کب مجھے بے ہوش کر کے میرا سب کچھ لوٹ لیتے ہو" چنبیلی پورے لٹ پٹ کر بہت
ن ہوتی۔ لیکن کہتے جانے سے بھی بڑی تحیر آمیز مسرت ہوتی" بڑی صفائی سے دل پر قینچی چلا جاتے ہو شامو" کوئی گاہک
، ذرا اچھا لگنے لگا تو چاپک معلوم ہوتا ہے کہ دل کو تم اڑا لے گئے ہو، اب اس بیچارے سے محبت کیسے کروں"۔

رامو اور شامو اپنے پیشے کے بادشاہ تھے تاہم ان کی قسمت کا کیا کیجئے گا کہ آجکل لوگ گھر بار ادھار کے
تے ہیں اور ان کی جیبوں میں مشکل سے بس کا کرایہ ہوتا ہے۔ لیکن لاکھ دیر ہو، اندھیر تو نہیں، آج شامو ایک ہی ہاتھ
پورے پانچ ہزار مار لایا۔ چنبیلی اور رامو اندر سے کھولی کی کنڈی چڑھا کر نہ معلوم کیا کر رہے تھے کہ شامو نے سالے
کو کسی اندرونی جیب میں سینے سے لگائے شراب کے نشے میں دھت آ پہنچا اور دائیں پاؤں سے جو دروازے کو پورے
سے ٹھوکر ماری تو دروازے نے ٹوٹنے سے بچانے کی خاطر ہڑبڑا کر اپنے آپ کو کھول دیا اور رامو سرعت سے چنبیلی سے
ہو کر کھڑا ہو گیا لیکن شامو کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے پھر اس سے جڑ کر بیٹھ گیا۔

لیکن تعجب ہے کہ آج شامو کی شرابی تیز نظروں نے بڑی شرافت سے خوش ہو کر انہیں نگل گیا۔ اس نے
بڑھ کر رامو کو چنبیلی سے پرے ڈھکیل دیا اور اس سے پہلے کہ رامو اپنی زبان کھولے نوٹوں کی گٹھیاں نکال کر ان کی
طرف پھینکنے لگا۔

"یہ لو..... یہ اور لو!..... یہ اور........ یہ ——! ——!!"

ملی اور رامو کی نظریں انبساط سے کانپ کانپ کر گٹھیوں کی جانب اچھلتی رہیں۔

"تمہیں اب بھی یقین نہیں آیا کہ میں نہایت شریف آدمی ہوں؟ —— اور چنبیلی تم —— تم صرف
ی بیوی ہو ——؟ اور ——"

چنبیلی گویا خواب کی کیفیت میں چل کر شامو کے ساتھ آ کھڑی ہوئی اور رامو نوٹوں کی ایک گٹھی

اٹھاتے ہوئے کیلئے ان کی پیروں کی جانب دیکھنے لگا۔"

" خبردار، چور کی اولاد۔! پہلے کان کھول کر سن لو کہ چنبیلی تمہاری کون ہے ـــــ جانتے ہو، کون ہے ـــ ؟"

راموں نے اپنے دونوں کان اثبات میں پکڑے اور سر ہلاتے ہوئے جواب دیا" ہاں"

" ہاں اور سنو، اپنی ماں سے تم نے منھ کالا کرنے کی کوشش کی تو تمہارا باپ اپنی پوری قینچی تمہارے کلیجے میں گھونپ دے گا! ـــــ

▲▲

آپ اپنی تشفی کیلئے ایک بار تشریف لائیں

عبداللہ اینڈ سنس

جہاں آپکی پسند کے مطابق اس قسم کی پائیدار اور پختہ رنگ کی لنگیاں، نئے ڈیزائن کی سوتی، ریشمی اور نائیلون گنجیاں، موزے، رومال، دوپٹے، برلیسیر، تولیے، گمچھے، تیار شدہ پوشاک نیز اونی پوشاک اور چادریں وغیرہ مناسب قیمتوں پر ہر وقت دستیاب ہیں۔

عبداللہ اینڈ سنس
مرزا غالب روڈ، آسنسول

احمد یوسف

دفینہ

ایک گاؤں کا قصہ ہے کہ وہاں ایک شخص رات کے سناٹے میں تازہ قبروں سے مردے برآمد کرتا، ان کے کفن
اتارتا اور پھر انہیں ان کی قبروں میں واپس پہنچا دیتا۔

یہ ظاہر تو یہ عمل بے حد دشوار گزار نظر آتا ہے لیکن اس چور کو ایک منتر آتا تھا، جس کے پڑھتے ہی مردہ قبر سے باہر آ جاتا
یا کفن اتار کر چور کے حوالے کرتا اور پھر سر جھکا کر اس کے حکم کی تعمیل کیلئے کھڑا ہو جاتا۔ چور کفن تہہ کرنے سے پہلے دوسرا منتر پڑھتا
یا اس کے منتر کے پڑھنے سے مردہ الٹے قدموں قبر میں واپس چلا جاتا اور قبر برابر ہو جاتی۔

چور کفن سمیٹ کر اندھیرے کا جگر لکل کھڑا ہوتا اور دوسرے دن بازار کھلنے پر کفن کا سودا کر لیتا۔
علم سینہ بہ سینہ کئی پشتوں سے اسکے خاندان میں چلا آ رہا تھا۔ اس طرح سے کئی پشتوں سے اسکے گھر میں دولت جمع ہوتی چلی آ رہی تھی
پشت کے دولت میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی کیا تھا۔

کفن بیچ کر وہ دام کھرے کر لیتا اور پھر تازہ مہم پر نکل کھڑا ہوتا۔ کس گھر سے کفن اور کافور کی بو آتی ہے؟ اگر
ہے گاؤں میں کوئی موت نہ ہوئی ہوتی تو نزدیک اور دور کی بستیوں میں نکل جاتا۔ اس طرح جو پیشہ باپ دادا سے اصل کرا ہے
ہیں نہ کہیں تو اچھی خبر مل ہی جاتی۔

اکیلا اس کا خاندان تھا جو اس آبادی میں اس علم سے بہرہ ور تھا۔ اس طرح اس پیشے میں اس کا کوئی مدمقابل نہیں
تھا اور یہ کہا جاتا تھا کہ اسکے آبا بھی بلا شرکت غیرے اس کاروبار سے نفع کماتے رہتے تھے۔

اور اس کا یہ پیشہ ایک ایسا راز تھا جسکے بستی کے کم و بیش بھی عاقل و بالغ کماحقہ واقف تھے اور عام خیال
تھا کہ جس طرح خیاطی، پارچہ بافی، زردوزی اور آہن گری پیشے ہیں اسی طرح یہ بھی ایک پیشہ ہے۔

ہاں مگر جب کبھی اس مجمع میں ہی میں لوگ یکجا ہو جائیں، چوپال میں سر شام، کسی تقریب میں یا کسی دوست کے گھر
تو پھر کتنی ہی باتوں کے ساتھ ساتھ اس کے پیشے کا بھی ذکر آ جاتا۔

یہ پیشہ کیا پیشہ ہے ———

آہ ....، ———

ن چور بھی اکثر چوپال میں آ جاتا، سماجی تقریبات میں شریک ہوتا اور انکے دکھ سکھ میں ان کا ساتھ دیتا۔ بس ایک آہ تھی جو اس
ذکر آتے ہی دلوں سے نکل جاتی تھی۔ دنیا کا دستور ہے کہ جو یہاں آتا ہے وہ یہاں سے جاتا بھی ہے، چنانچہ ایک دن اس کا بھی آخری
وقت آ گیا اس نے چاروں بیٹوں کو بلا کر اونچ نیچ سمجھایا ———

"یہ مال و متاع، یہ جاہ و حشمت ——— پر بیٹے مرے بعد میرے کاروبار کو اور فروغ دینا"

کہہ کر وہ اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گیا۔

لڑکے روئے دھوئے، چالیس دنوں تک یہ کام چلا اور پھر اسکے مال و اسباب پر نظر دوڑائی اور ان کا حساب کتاب کیا۔ اب لڑکوں کو یہ معلوم ہوا کہ باپ اتنا چھوڑ گیا ہے کہ بغیر کچھ کئے دھرے فراغت سے گذر ہو سکتی ہے۔ یہ سوچ کر وہ آرام سے گھر بیٹھ گئے اور باپ دادا کی حاصل کی ہوئی جائداد کو اپنے تصرف میں لانے لگے۔

گاؤں والوں کو جب اس بات کا علم ہوا کہ لڑکے آبائی پیشہ ترک کر چکے ہیں تو انہوں نے اطمینان کی سانس لی۔

"بحمد اللہ کہ اب مردوں کے دن پلٹے"

لیکن تب یہ ہوا کہ باپ باری باری چاروں بیٹوں کے خواب میں آیا، اور کئی دنوں تک آتا رہا۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ آبائی پیشے کو فروغ دینا، یہ آخر تم کیا کر رہے ہو؟"

اس پر بیٹوں کو سخت ندامت ہوئی کہ ابھی باپ کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے اس کی نصیحتوں کو یک قلم فراموش کر دیا۔

وہ سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور یہ فیصلہ کر کے اٹھے کہ انہیں باپ دادا کے کاروبار کو بہرحال زندہ رکھنا ہے اور یہ کرنے کے لیے انہوں نے ایک نئی قبر کا سراغ لگایا اور جب رات کا اندھیرا ہر سو پھیل گیا تو اپنے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ وہ آگے پیچھے قبرستان کی راہ پر چلے جا رہے تھے۔ ان میں ایک ہاتھ میں تھیلا تھا جس میں ایک تیز چاقو پڑا تھا۔ انکے دلوں میں شادیانے بج رہے تھے۔ باپ کی روح خوش ہو جائیگی۔

تازہ قبر پر پہنچ کر بھائیوں میں سے ایک نے اپنا وہ خاندانی منتر پڑھا۔ لگا قبر شق ہوئی۔ مردہ برآمد ہوا اور بڑی سرعت سے اس نے اپنا کفن اتار کر ان کے حوالے کیا اور پھر انکے حکم کے انتظار میں سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں ہی ایک بھائی نے تھیلے سے چاقو نکال کر مردے کی ناک کاٹ لی۔

نہ ضد نہ تڑپ نہ احتجاج۔ بس ایک سرد سی شے اسکے ہاتھ میں آگئی۔ جسے اس نے زمین پر پھینک دیا۔ دوسرا منتر پڑھنے پر مردہ قبر میں چلا گیا۔ اس پر انہیں اطمینان سا پیدا ہوا کہ کاروبار بھی شروع ہو گیا۔ اور ذرا رگ و پے میں گرمی بھی آگئی ___ لیکن جب بازار میں کفن بکنے کی خبر ملی تو بستی والے سناٹے میں آگئے کہ وہ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ کفن کی چوری باپ پر ختم ہو گئی۔

شدہ شدہ انہیں یہ خبر ملی کہ وہ مردوں کے عضو بھی کاٹ لیتے ہیں۔ ان کے دل بھاری ہو گئے۔

دوسری رات وہ چاروں پھر ایک تازہ قبر کا سراغ لگا کر قبرستان پہنچے۔ آج انکے تھیلے میں تیز چاقو کے علاوہ آری اور ہتھوڑی بھی تھی۔ منتر پڑھنے پر مردہ برآمد ہوا اور اس نے اپنا کفن انکے حوالے کر دیا۔ تب ہی تھیلے والے نے آگے بڑھ کر مردے کے دونوں کان کاٹ لئے اور اسکے بعد آری اور ہتھوڑی کی مدد سے کہنیوں تک اسکے ہاتھ بھی قلم کر دیے اور انہیں قبرستان کے آسمان میں اچھال دیا۔

دوسرا منتر پڑھنے پر کٹا پھٹا مردہ اپنی قبر میں واپس چلا گیا۔ کفن سنبھال کر وہ اپنے گھر کو چل دیے۔ وہ آج کی کاروائی سے بہت مطمئن تھے اور انہیں یہ محسوس ہوا تھا کہ انکی پشتیں انکے ساتھ ہنستی بولتی انہیں مبارکباد دیتی چلی آ رہی ہیں۔

لیکن جب سر شام بستی کے لوگ چوپال میں اکٹھے ہوئے تو انکے دلوں میں خاک سی اڑ رہی تھی۔ "ان کا باپ تو پھر بھی معصوم تھا کہ صرف کفن ہی چراتا تھا۔ یہ تو کفن بھی چراتے ہیں اور مردے کی بے حرمتی بھی کرتے ہیں۔ اُف ___ اُف"

▲▲

غالب کی شخصیت و شاعری پر نسلی اثرات

ڈاکٹر سلام سندیلوی

دور حاضر میں یہ بات متفقہ طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ ادب آرٹ ہے اور تنقید ایک قسم کی سائنس ہے اس لئے ادب کو سمجھنے کیلئے سائنس کی مدد لینا ضروری ہے۔ ماہرین سائنس اس بات پر متفق ہیں کہ جانداروں کی خصوصیات ان کی نسلوں میں منتقل ہو جاتی ہیں چنانچہ آسٹریا کے باشندے گریگو رمنڈل (Gregor Mendel) نے اس سلسلے میں بہت تحقیق کی۔ گریگو رمنڈل (۱۸۲۲ء سے ۱۸۸۴ء) ایک زبردست ماہر نباتات اور ماہر حیوانات گزرا ہے۔ اس نے بہت سے پودوں اور جانوروں پر تجربات کئے اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان کی خصوصیات ان کی بعد کی نسلوں میں منتقل ہو جاتی ہیں۔

ماہرین نفسیات بھی اس نظریہ سے متفق ہیں چنانچہ سوئٹزرلینڈ کا باشندہ کارل ینگ (Carl Jung) (۱۸۷۵ء سے ۱۹۶۱ء) اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسانی خون میں اس کی نسل کے اثرات پیوست ہو جاتے ہیں اور اس کی زندگی میں نمودار ہوتے ہیں۔ بہر حال مشہور ماہر نفسیات کارل ینگ نے بتایا کہ ایک انسان کی نسل کے اثرات بہت دیرپا ثابت ہوتے ہیں اس کا قول ہے کہ ایک شخص کے آباؤ اجداد کا اثر اس کی زندگی پر بہت گہرا پڑتا ہے یہی نہیں بلکہ شاعر کے کلام پر اس کے نسلی اثرات مثبت ہوتے ہیں۔ کارل ینگ کے اس قول کی روشنی میں ہم یہ پتا لگا سکتے ہیں کہ غالب کی شخصیت و شاعری پر ان کے نسلی اثرات کس حد تک مثبت ہیں۔

جلال پور فتح علی کا چارنے اپنی تصنیف "نامۂ خسرواں" میں قدیم ایران کی شاہی حکومتوں کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے آغاز آبادیان سے انجام ساسانیاں تک کے بادشاہوں کے حالات درج کئے ہیں۔ اس نے قدیم ایرانی حکومتوں کے پانچ خاندانوں میں تقسیم کیا ہے (۱) آبادیان (۲) جیان (۳) شائیان (۴) یاسائیان (۵) گلشائیان۔ گلشائیان کی حکومت پیشدادیان خاندان کی بنیاد ۵۵۰ قبل مسیح پڑ چکی تھی۔ اس خاندان کا بانی کیومرث ہے۔ اس خاندان میں سیامک، ہوشنگ، تہمورس، جمشید اور ضحاک وغیرہ بادشاہ گزرے ہیں، اس خاندان کا ساتواں بادشاہ فریدون ہوا ہے۔ فریدون ہی غالب کا مورث اعلیٰ ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد اس خاندان پر زوال آگیا اور اس کی جگہ پر کیانیاں حکومت کرنے لگے۔ اس کے بعد اشکانیاں حکومت قائم ہوئی۔ گرچہ پیشدادیاں خاندان کا زوال ہو چکا تھا مگر اس کا افراد نیست و نابود نہیں ہوئے تھے بلکہ اسی خاندان کے ایک شہزادے قوتاق نے ترکستان میں اقامت اختیار کی، اس کے بعد اس کے بیٹے سلجوق نے ایران میں سلجوقی حکومت قائم کر لی اس خاندان میں بڑے بڑے بادشاہ گزرے ہیں مثلاً طغرل، الپ ارسلان، ملک سنجر وغیرہ، ان بادشاہوں نے ایران میں شاندار طریقے سے حکومت قائم کی۔

کچھ مدت کے بعد سلجوقی خاندان بھی تباہ ہو گیا، اس خاندان کے ایک شہزادے کا نام ترسم خاں تھا وہ سمرقند میں مقیم ہوا لیکن اس کا بیٹا قوقان بیگ اپنے باپ سے ناراض ہو کر محمد شاہ کے زمانے میں ہندوستان آیا۔ وہ لاہور میں نواب معین الملک

(زرف میر منو) کے دربار میں ملازم ہوگیا۔ سنہ ۱۷۵۳ء میں جب معین الملک کا انتقال ہوگیا تو قوقان بیگ کی ملازمت ختم ہوگئی وہ کچھ عرصہ تک بیکار رہا۔ اسکے بعد قوقان بیگ دلّی آیا اور نواب ذوالفقارالدولہ کا ملازم ہوگیا۔ پھر انہیں کی وساطت سے شاہ عالم کے دربار میں رسائی حاصل کرلی وہاں وہ ۵۰ سواروں کا سردار مقرر ہوگیا۔ اسکو نقارہ ملا اس کے علاوہ پہاسو کا پرگنہ بھی بخشدیا گیا۔ قوقان بیگ کی سات اولادیں تھیں، چار بیٹے، تین بیٹیاں، سب بڑے بیٹے کا نام مرزا عبداللہ بیگ تھا جو غالب کے پدر بزرگوار تھے۔

غالب کا خاندانی شجرہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان میں برتری کا جذبہ پیدا ہوگیا تھا اس جذبے کو علم النفسیات میں MAGOLOMANIA کہتے ہیں۔ غالب کی شاعری میں مختلف مقامات پر اس جذبے کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ ثبوت میں مرزا غالب کا وہ فارسی قطعہ پیش کیا جاسکتا ہے جسکو مولانا حالی نے "یادگار غالب" میں درج کیا ہے۔

غالب از خاک پاک تورانیم — لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی — بہ سترگان قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعۂ اتراک — در تمامی ز ماہ دہ چندیم
فن آبائے ما کشاورزیست — مرزبان زادۂ سمرقندیم
در زمعنی سخن گذارد کسے — خود چہ گویم تا چند و چندیم
فیض حق را کمینہ شاگردیم — عقل را ہینہ فرزندیم
ہم بہ تابش بہ برق ہمسنگیم — ہم بہ بخشش برابر ماندیم
تا نہ شیکم بہست فیروزیم — بہ علفے کہ ہست خرسندیم
ہمہ بر خویشتن ہمی گرییم — ہمہ بر روزگار می خندیم

اس فارسی قطعہ کے علاوہ غالب نے اور بھی ایسے فارسی اور اردو کے اشعار کہے ہیں جن سے ان کا جذبہ برتری ظاہر ہوتا ہے مثلاً انکے اردو کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری — کچھ شاعری ہی ذریعۂ عزت نہیں مجھے
آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے — مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا
گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے — جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے
ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے — کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور
ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا — صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کیلئے
آج مجھ سا نہیں زمانے میں — شاعر نغز گوئے خوش گفتار
ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب — کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں　　دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے سخن کی میں　　روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

غالب کے دیوان میں اس قسم کے بہت سے اشعار ملتے ہیں جن سے ان کا جذبۂ برتری ظاہر ہوتا ہے۔ یہ جذبۂ برتری محض ان کی خاندانی برتری کی بنا پر نمودار ہوا ہے۔ غالب کا جذبۂ برتری کبھی کبھی جذبۂ محبوبیت میں منتقل ہو جاتا ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام　　مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

فریب دینا صرف معشوقوں کا کام ہے مگر اس شعر میں غالب نے اپنے محبوب کو فریب دیا ہے۔ انہوں نے لیلیٰ کے سامنے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے اور وہ بہت متاثر ہوئی اس نے کہا کہ مجنوں اب تک فریب دیتا رہا کیونکہ وہ سچا عاشق نہیں تھا اس سے بڑے عاشق آپ ہیں۔

مرزا غالب کی شخصیت میں ایک اور خصوصیت بہت زیادہ نمایاں ہے، نسلی برتری، خاندانی فوقیت اور اعلیٰ ماحول کی وجہ سے ان میں خودداری کا جذبہ (Self Esteem) پیدا ہو گیا تھا، انہوں نے دہلی میں اپنے مرتبے کو قائم رکھنے کی کوشش کی اگرچہ غالب کی مالی حیثیت بہت زیادہ اچھی نہیں تھی مگر وہ دہلی میں امیرانہ شان سے زندگی بسر کرتے تھے چونکہ ان کے تعلقات شہر کے رؤسا سے خوشگوار تھے اس لئے دہلی میں انکی قدر و منزلت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ غالب میں خودداری کی شان پیدا ہو گئی تھی۔ ان کی زندگی کے مختلف واقعات انکی خودداری پر روشنی ڈالتے ہیں۔

مرزا غالب نے سنہ ۱۸۲۶ء میں اپنی پینشن کے تصفیے کے سلسلے میں کلکتہ کا سفر کیا۔ انہوں نے جاتے وقت لکھنؤ میں قیام کیا اور وہاں کئی مہینے ٹھہرے، اس وقت لکھنؤ میں نواب غازی الدین حیدر بادشاہ تھے۔ اور معتمد الدولہ آغا میر وزارت کے عہدے پر فائز تھے۔ غالب نے نواب غازی الدین حیدر کی شان میں ایک معرکۃ الآرا قصیدہ کہا تھا اور انکی خواہش تھی کہ اس قصیدے کو بادشاہ کے حضور میں پیش کریں۔ غالب کا یہ بھی مقصد تھا کہ ان کو اس قصیدے کے صلے میں اتنی معقول رقم ملجائے تاکہ وہ کلکتے کے اخراجات برداشت کر سکیں مگر غالب کو یہ قصیدہ نواب غازی الدین کی خدمت میں پیش کرنے کا موقع نہ مل سکا یہی نہیں بلکہ انکی ملاقات وزیر آغا میر سے بھی نہ ہو سکی۔ جن کی شان میں انہوں نے مداحیہ نثر لکھی تھی اس کا سبب یہ تھا کہ غالب نے آغا میر سے ملاقات کیلئے دو شرطیں رکھی تھیں پہلی شرط یہ تھی کہ ان کو نذر دینے سے معاف کیا جائے۔ نواب وزیر نے یہ شرطیں منظور نہیں کیں اس لئے غالب ان سے ملاقات کئے بغیر لکھنؤ سے رخصت ہو گئے اس واقعے سے غالب کی خودداری پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔

مرزا غالب کی خودداری کی ایک اور مثال موجود ہے سنہ ۱۸۴۲ء میں ہندوستان کے سکریٹری جیمس ٹامسن دلی کالج کے معائنے کیلئے آئے انہوں نے کہا کہ عربی کی طرح اس کالج میں فارسی کا بھی ایک مدرس ہونا چاہئے صدرالدین آزردہ نے اس جگہ کیلئے مرزا غالب، مومن اور مولوی امام بخش صہبائی کے نام پیش کئے چونکہ ان تینوں میں مرزا غالب کی شہرت مسلم تھی اسلئے مسٹر ٹامسن سکریٹری گورنمنٹ ہند نے سب سے پہلے مرزا غالب کو انٹرویو کیلئے

طلب کیا۔ مرزا صاحب اپنی پالکی پر سوار ہوکر سکریٹری کے ڈیرے پر پہونچے اور اس بات کے منتظر رہے کہ سکریٹری صاحب انکے استقبال کیلئے آئیں۔ جب مرزا صاحب کے اندر پہونچنے میں کچھ تاخیر ہوئی تو ٹامسن نے ایک جمعدار کو تاخیر کا سبب معلوم کرنے کیلئے روانہ کیا۔ مرزا صاحب نے جواب دیا کہ حسب دستور ٹامسن صاحب میرے استقبال کو آئیں تو میں اندر جاؤنگا۔ یہ بات سنکر سکریٹری صاحب باہر نکل آئے اور مرزا صاحب سے کہا جب دربار گورنری میں تشریف لائیں گے تو ایک رئیس کی حیثیت سے آپکا استقبال کیا جائیگا مگر یہاں آپ ملازمت کے سلسلہ میں آئے ہیں اس موقع پر دلیسا برتاؤ نہیں ہوسکتا۔ مرزا غالب نے جواب دیا کہ میرا سرکاری ملازمت کرنے کا اس وجہ سے ارادہ تھا کہ میرے اعزاز میں اضافہ ہو نہ کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آجائے۔ سکریٹری صاحب نے کہا کہ ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔ تب مرزا صاحب نے جواب دیا تو پھر مجھکو اس خدمت سے معاف کیا جائے۔ یہ کہہ کر وہ اپنے مکان واپس چلے آئے'

ان واقعات کے علاوہ غالب کے دیوان میں خودداری کے بہت سے اشعار ملتے ہیں جن سے انکے مخصوص جذبے پر روشنی پڑتی ہے، مثلاً غالب نے معشوق کی محبت کے سلسلے میں خودداری کا اظہار کیا ہے' وہ فرماتے ہیں۔

پھلا ترے دم دو کہنے پہ بھی راضی کہ کبھی ۔۔۔ گوش منت کش گل بانگ تسلی نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو ۔۔۔ اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں ۔۔۔ سبک سر بنکے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا ۔۔۔ تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

غالب اس بات کیخلاف ہیں کہ فرہاد نے شیریں کو حاصل کرنے کیلئے مزدوری کی' یہ بات خودداری کیخلاف ہے

عشق و مزدوری عشرت گہہ خسرو کیا خوب ۔۔۔ ہم کو تسلیم نکونامی فرہاد نہیں

غالب کی خودداری اس درجہ تک بڑھ گئی کہ وہ عبادت میں بھی اس کا اظہار کرتے ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

بندگی میں بھی وہ آزاد و خودبیں ہیں کہ ہم ۔۔۔ الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

غالب دوائے احسان سے بھی گریز کرتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں۔

درد کش منت دوا نہ ہوا ۔۔۔ میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

غالب کی خودداری کے اور بھی مختلف پہلو ہیں جنکا ذکر اس مقام پر ضروری ہے' ان میں خودداری کے علاوہ وضع داری بھی پائی جاتی ہے۔

واں وہ غرور عز و ناز یاں یہ حجاب پاس وضع ۔۔۔ راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائیں کہاں

غالب کی خودداری کبھی کبھی بے دماغی کا روپ دھار لیتی ہے مثلاً وہ کہتے ہیں۔

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے ۔۔۔ کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

غالب حد درجہ خوددار تھے۔ مگر آخر عمر میں فکر تلاش نے انکی خودداری کے آئینہ کو پاش پاش کر دیا تھا یہی وجہ ہے کہ انکو بہادر شاہ ظفر کی ملازمت اختیار کرنی پڑی جسکے بارے میں وہ کہتے ہیں ؎

وہ دن گئے جو کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں　　غالب وظیفہ خوار ہوں دو شاہ کو دعا

یہی نہیں جب بہادر شاہ قید کرکے رنگون روانہ کر دئے گئے تو غالب نے انگریزوں کی شان میں قصیدے کہے، ایک قصیدہ انھوں نے ملکہ وکٹوریہ کی شان میں کہہ کر لندن بھیجا' اس کے علاوہ انھوں نے ایلن براؤن اور میکلوڈ کی تعریف میں بھی قصیدے کہے ہیں یہی نہیں بلکہ بہت سے انگریزوں افسروں کی بھی مدح سرائی کی ہے۔ دراصل غالب آخری عمر میں فکر معاش کے اسیر ہو گئے تھے اس لئے وہ اپنی خود داری کو برقرار نہ رکھ سکے۔

آخر میں ہم اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ غالب کی شخصیت و شاعری پر ان کے نسلی اثرات مثبت ہیں جو جذبۂ برتری اور جذبۂ خود داری کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔ ▲▲▲

جسم کی خوبصورتی عمدہ لباس سے ہوتی ہے
کپڑے ہمیشہ عمدہ سلوائیے

ڈورا جنٹس ٹیلرس

آپ ہمارے یہاں مناسب نرخوں پر بہترین کپڑے سلوائیے۔

DORA GENTS Tailors
G.C. MITRA ROAD
ASANSOL - 713301

پروین شاکر

احمد ندیم قاسمی ▲ سردار جعفری

■ پروین جذبے کی شدت اور شائستگی کی شاعرہ ہے۔ جذبے کا سچا، کھرا اور خوبصورت اظہار اس کی شاعری کا کرشمہ ہے۔ نہ وہ آئینہ آپ کو فریب دیتا ہے اور نہ اپنے قاری سے کچھ چھپاتی ہے۔ اس نے محبت کے جذبے کی حیرت انگیز تہذیب کی ہے۔ پروین نے اس پامال موضوع کو درخورِ بخشی اور اس کی قدامت کو جدت میں بدل دیا ہے۔ اس نے اپنے پسندیدہ موضوع کو اہم نہیں بنا لیا ہے بلکہ اس کا دل آویز فن ہمہ وقت چارسو نگراں رہتا ہے۔ پروین کی آواز کے زیر و بم میں روحِ عصر کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ اردو شاعری میں یہ ہر لحاظ سے ایک نئی آواز ہے، منفرد، جمیل اور مستقبل گیر آواز ——

فہمیدہ ریاض

زندگی کو بے حس بنا دینے والے روزمرہ سے چند لمحے بچا کر، آپ کبھی کسی کنجِ عافیت میں سکون سے بیٹھے ہیں؟ اور پھولوں پر منڈلاتی، ٹھہرتی، پنکھ جوڑتی اور کھولتی تتلی کو غور سے دیکھا ہے؟ اس کے نرم و نازک، سبک پروں پر پھیلتی، ایک دوسرے میں گھلتی رنگوں کی لکیروں کو کانپتے دیکھا ہے؟ پروین شاکر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "خوشبو" اس ہولے سے تھرتھراتے ہوئے تتلی کے پنکھ کا ہی دوسرا نام ہے۔

سردار جعفری

پروین کی شاعری کا محور عشق ہے، اس کی تشبیہیں اور استعارے زیادہ تر فطرت سے لیے گئے ہیں، دھوپ، سورج، چاند، روشنی، پھول، بادل، پانی، ہوائیں۔ انھیں سے مل کر اس کی امیجری کی تعمیر ہوتی ہے لیکن اس کے عشق کے گرد شعور کا ایک خوبصورت ہالہ ہے، سماجی اور سیاسی احساس کا پرتو ہے۔ اس کی شاعری حسنِ صورت، حسنِ سیرت، حسنِ زبان اور حسنِ بیان سے آراستہ ہے۔ اسلئے اس دور میں دور دور تک کہیں اس عہد کی مردم بیزاری نہیں ہے۔ ذاتی تلخی اور خیال کے الجھاوے نہیں ہیں۔ وہ بصیرت ہے جو زندگی کو شائستہ بناتی ہے اور انسانی تہذیب کو وقار بخشتی ہے۔ لہجے کی تازگی میں بلا کی کشش ہے میں شاعروں کی محفل میں پروین شاکر کا خیر مقدم کرتا ہوں وہ شاعری کے مستقبل کیلئے ایک خوبصورت بشارت ہیں۔

▲

...ردیں شاعر

Accession Number 12632
Date 22-12

...ں وقت

...آنکھ میں شام اترے
...پہ شفق پھولے
...ل کی طرح، میری
...ں کی دھنک چھولے
...نت کوئی اس کو
...دل سے مری دیکھے
...سے مری چومے

مجبوری

ہوائیں
دستکوں میں میرا نام لے رہی ہیں
میں کواڑ کیسے کھولوں
میرے دونوں ہاتھ تو پشت کی طرف
بندھے ہوئے ہیں

موسم

چڑیا پوری بھیگ چکی ہے
اور درخت بھی پتہ پتہ ٹپک رہا ہے
گھونسلہ کب کا بکھر چکا ہے
چڑیا پھر بھی چہک رہی ہے
انگ انگ سے بول رہی ہے
اس موسم میں بھیگتے رہنا کتنا اچھا لگتا ہے

غزل

...ا آئے نہ برگ تر ہی ٹھہرے
...تیز بہت ہوا کے ناخن
...ک تو بنے خزاں کا ساتھی
...شہر سخن فروشگاں میں
...چکھی اذاں کی بھی قیمت
...نے سے چمک اٹھے تو مجھ سے
...ر کو آنکھ رنگ چھو لے
...شہر میں ہیں، یہی ہے بہت
...ود آپ سوختہ مقدر
...ے لئے منتظر ہو۔ وہ بھی
...ب سے پیار تھا سو میرے

دکھ پیڑ کے بے ثمری ٹھہرے
خوش ہے کہ ہو کہ گھر ہی ٹھہرے
پیتا نہ سبھی شجر ہی ٹھہرے
ہم جیسے تو بے ہنر ہی ٹھہرے
آخر مرے بال و پر ہی ٹھہرے
اچھے مرے بام و در ہی ٹھہرے
تتلی پہ اگر نظر ہی ٹھہرے
کس نے کہا میرے گھر ہی ٹھہرے
ہاں آپ ستارہ گر ہی ٹھہرے
جاتے سر رہ گزر ہی ٹھہرے
پاؤں میں سدا بھنور ہی ٹھہرے

کرشن چندر — چند لمحاتی تاثرات

حمید سہروردی

کتنے ہی لوگ ہیں جو ریم کے ریم کاغذ سیاہ کرتے ہیں مگر ان میں چند ہی ایسے ہوتے ہیں، جو کاغذ اور لفظ ایک مضبوط اور مربوط رشتہ پیدا کرتے ہیں اور یہ رشتہ انسانی دلوں کو گرمانے، ان کے جذبات میں اشتعال پیدا اور فکر و عقل کو نئی جہت عطا کرنے کی قوت عطا کرتا ہے۔ ایسا ہی معدودے چند قلمکاروں میں کرشن چند اور منفرد مقام حاصل ہوا ہے۔ کرشن چندر کی شخصیت ہمہ گیریت اختیار کر چکی ہے۔ باوجود غم و غصہ نفرت و حقارت، سیاسی چالاکیاں اور پینترے بازیوں کے انکی اپنی جگہ اٹل اور مضبوط ہے۔ کرشن چ جتنا کچھ بھی لکھا ہے وہ تمام کا تمام نثر میں ہے۔ افسانہ ہو کہ ڈرامہ، انشائیہ ہو کہ مضمون، طنزیہ ہو کہ المیہ ہو کہ طربیہ، انہوں نے اپنی تحریروں میں یا فن پاروں میں عمر کی تفاوت سے یکسر انحراف کیا ہے۔ یعنی انہ بچوں، جوانوں اور بوڑھوں سبھی کیلئے لکھا ہے اور وہ سب کا سب نثر میں اور صرف نثر میں لکھا ہے۔

کوئی بھی تخلیقی فنکار طے شدہ اور رائج شدہ تکنیکی، اصولوں، ضابطوں اور قواعد کو پیش نظر رکھ کر نہیں لکھتا بلکہ اسکے نزدیک تخلیقی تقاضے اہم اور مقدم ہوتے ہیں۔ چونکہ فنکار بنیادی آزاد ذہنی اور بلند خیالی کا قائل ہوتا ہے اس لئے وہ موضوع ہو کہ تکنیک، پلاٹ ہو کہ کردار، منظر نگا کہ جزئیات نگاری ہر وقت اور ہر افسانہ میں ایک نیا زاویہ، نیا انداز اور نرالے ڈھنگ سے پیش کرتا ہے۔ تخلیقی سطح پر تغیر و تبدل کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ کرشن چندر کے عمدہ اور بہترین افسانوں لیا جائے تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچتی ہے کہ کرشن چندر نے رسمی روایتی انداز میں فن کا احترام نہیں کیا۔ بلکہ کے نشیب و فراز، اتار چڑھاؤ کو ملحوظ رکھتے ہوئے فنی اور موضوعاتی تبدیلیوں کا شاندار اور جاندار خیر مقد شاید ہی کوئی ان کا ہم عصر افسانہ نگار ہوگا جس نے انکے مقابلے میں تکنیکی تجربے اور موضوعاتی تنوع اور رنگ اپنے فن پاروں میں استعمال کیا ہوگا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کرشن چندر ایک ازم سے ذہنی و روحانی طور پر وا تاہم یہ بات بھی اتنی ہی آواز میں کہی جا سکتی ہے کہ کرشن چندر نے زندگی کے ہمہ جہت پہلوؤں پر اپنے مشا اور تجربے کے ذریعہ قلم اٹھایا ہے۔

کرشن چندر جہاں اپنے افسانوں اور تحریروں میں رومانی واقعہ کار کو بروئے کار لاتے ہیں انہوں نے حقیقت پسندانہ غور و فکر سے افسانوی ماحول اور کرداروں کو فعال اور متحرک بنایا ہے۔ دراصل کرشن چندر رومانی انداز اور حقیقت پسندانہ طرز فکر کے ملاپ سے اپنا اچھوتا اور پیارا اور انوکھا اسلوب دریافت کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے اسلوب میں شگفتگی و شیفتگی، شادابی و تر و تازگی، دلکشی و دلنشینی نکھرتی بکھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایسا کہ ان سے پہلے شاعرانہ زبان کا استعمال نثر میں نہیں ہوا ہے۔ تشبیہ و تمثیل سے کام لیتے ہوئے ان سے پہلے افسانہ

ہر یا روں نے اردو ادب کے دامن کو مالا مال کیا ہے۔ مگر ان بزرگ افسانہ نگاروں کے یہاں موضوع سے
ن کی اہمیت تھی۔ برخلاف اسکے کرشن چندر نے صرف زبان پر ہی اپنی قوت و توانائی صرف کی ہے بلکہ موضوع
لیت کو سمجھا اور سمجھایا ہے۔ تاہم یہ کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ جہاں انہوں نے زبان کی رنگینی اور
ہ کیا ہے وہاں انہیں نقصان سے بھی دوچار ہونا پڑا ہے۔ وہ اسلئے کہ کرشن چندر کے افسانوں کے بہت سے
ھے لکھے اور جاہل کرداروں کی زبان میں تمیز و فرق کم ہی پایا جاتا ہے۔

کرشن چندر کرداروں کو پیش کرنے کے معاملہ میں کافی فراخدل ثابت ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں
راعلیٰ سے اعلیٰ کردار ہوتے ہیں۔ یہ کبھی الگ سے افسانہ کے افق پر نمودار نہیں ہوتے بلکہ دونوں کردار
محبت ہوتی ہے وہاں رقابت و عداوت کا جذبہ بھی موجزن ہوتا ہے۔ کرشن چندر ان کرداروں کے آپسی
کے ساتھ سماجی و معاشرتی، تہذیبی و تمدنی تصادم اور ٹکراؤ کو نمایاں کرتے ہیں اور یہ عجیب اتفاق
ے کرداروں میں کشمکش تو نظر آتی ہے مگر کرشن چندر ان کرداروں کا تحلیل و تجزیہ کرتے ہوئے
بسا اوقات وہ کرداروں کو قیمتی اور پھٹے پرانے پوشاکوں کو دیکھتے اور دکھاتے ہیں۔
جا تک کر ان کی کمزوریوں اور خامیوں، اچھائیوں اور خرابیوں پر نظر نہیں ڈالتے۔ یوں لگتا ہے کہ
رخوبیوں کو عمداً نظر انداز کر رہے ہیں۔ دراصل ان کے کرداروں کا رجحان طے شدہ ازم یا تھیوری کے
ہے۔ اسلئے ان کرداروں میں تحرک اور چل پھل تو نظر آتی ہے مگر ان کا نفسیاتی اور ذہنی عمل مفقود کر
جائزہ لیں تو یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے یہاں امیر کردار صرف روپیہ پر اپنی جان دیتے ہیں
جاتی ہیں اور مزدور محنت و مزدوری ہی کو عبادت سمجھتے ہیں اور سرمایہ داروں اور سرمایہ داری
قائل نظر آتے ہیں۔

یہ مادہ نظریہ طے شدہ تصویر ہی کی دین ہے۔ پس کرشن چندر حقیقت کے قریب ہوتے ہوئے
تے ہیں۔

کے افسانوں کا اختتام ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت ہوتا ہے۔ سعادت حسن منٹو کی طرح
خیز نہیں ہوتا۔

رنے جہاں مزاح سے کام لیا ہے، وہاں وہ پطرس کی طرح صرف ہنسنے اور مسکرانے پر اکتفا نہیں کرتے
ام لیتے ہیں۔ برخلاف اسکے طنز کی آنچ تیز تر ہوتی ہے بعض اوقات ایسا لگتا ہے کہ وہ صحافتی انداز
ن لیڈروں کی جھنجھلاہٹ پر اتر آئے ہیں۔

و تا ہیوں اور خامیوں کے کرشن چندر نے اردو افسانہ کو ایک اعلیٰ و ارفع مقام عطا کیا ہے جو
ےکے یا انکی دسترس میں نہیں تھا یا پھر ان کے جذبہ و احساس اور فکر و تعقل میں نہیں پہنچ سکا۔

شاعرانہ نثر اور فنکارانہ ذہن نے پایۂ تکمیل کو پہونچایا ہے۔

ندا فاضلی

غزل

ادھر ادھر کئی منزل ہیں چل سکو تو چلو
بنے بنائے ہیں سانچے جو ڈھل سکو تو چلو

یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا
مجھے گرا کے اگر تم سنبھل سکو تو چلو

ہر اک سفر کو ہے محفوظ راستوں کی تلاش
حفاظتوں کی روایت بدل سکو تو چلو

کہیں نہیں کوئی سورج دھواں دھواں ہے فضا
خود اپنے آپ سے باہر نکل سکو تو چلو

غزل

جہاں نہ تیری مہک ہو ادھر نہ جاؤں
مری سرشت سفر ہے گزر نہ جاؤں
مرے بدن میں کھلے جنگلوں کی مٹی
مجھے سنبھال کے رکھنا بکھر نہ جاؤں
مرے مزاج میں بے معنی الجھنیں ہیں
مجھے ادھر سے بلانا جدھر نہ جاؤں
کہیں پکار نہ لے گہری وادیوں
کسی مقام پہ [illegible] ٹھہر نہ جاؤں
نہ جانے [illegible]
قریب گھر کے رہوں اور گھر نہ جا

فضیل جعفری

غزل

ناکام لوٹتے ہیں کبھی شادکام ہم
اس کی گلی میں اکثر کرتے ہیں قیام ہم
دل کا نہیں تو لفظوں کا جادو ہی چل سکے
پڑھتے ہیں اس خیال سے علم الکلام ہم
رو رو کے صبح کرنا تو شیوہ تھا میر کا
یاں لڑ جھگڑ کے صبح سے کرتے ہیں شام ہم
یہ نشہ اسیرٹ کا نہیں! جانِ انجمن
بھرتے ہیں خونِ دل سے ترے گاہوں کا جام ہم

▲

غزل

پتھر کرتے ہیں فریاد
نئی عمارت، زندہ باد
دل معصوم، نظر جلاد
ہم قاری، قسمت نقاد
پیار، شکار، غزل، بجرا

سخت مزے میں تھے اجداد
بمبئی، دلی، جنگل ہیں
شہر ہے ایک — الہ آباد

▲

تسلیم احمد

غزل

جو سنے شہرِ زیاں کا ماجرا
بھول جائے اپنے گھر کا راستہ

میں رہا ٹوٹے ہوئے شیشوں کے ساتھ
ہر تعلق نے مجھے زخمی کیا

ٹکڑوں ٹکڑوں میں بسر کرتا ہوں عمر
لمحہ بھر کو جی اٹھا پھر مر گیا

جیسے ہمسائے ہوں میرے شہر کے
خواہشیں باہم نہیں ہیں آشنا

رات بھر پرچھائیوں سے جنگ کی
میرا دشمن ایک مٹی کا دیا

ہم نفس انسان کا کوئی تو ہو
دوست دشمن آشنا نا آشنا

یوں تو دنیا میں سبھی اچھے نہیں
تم تو اچھے تھے تمہیں نے کیا کیا

بجھ چکی ہے مر گئی پہچان بھی
ایک ہے میرے لیے اچھا برا

میں کسی سے کیا وفا کرتا سلیم
میں نے اپنے ساتھ ہی دھوکا دیا

غزل

لوگ مرتے ہیں فائدے پہ جہا
میں نے کھولی وہاں دکان ز
شب آفاق کا چراغ ہے
یہ مرا دل، یہ شعلۂ رقص
دوستی، دشمنی، وصال،
ایک لمحے میں ہیں کئی ام
دل میں شاید کسی کی یاد
شاید آباد ہو کبھی یہ م
ساحلوں پر سکوت ہے
آج کی رات آ سکے گا طوف
کوئی پوچھے نئے چراغوں
جل بجھے جو دیئے وہ جہاں
دور ایسا بھی آئے گا
ایک ہو گی محبتوں کی ز
شب کو دیکھا تھا خواب
صبح جاگے تو پھر وہی زند
مجھ سے یزداں کو بھی ام
اہرمن بھی مری طرف
ہم ہیں تیرے ہی روشنی ہے
گھر میں آئے تو رات
لوگ کچھ دیر آ کے ٹھہرے
یہ جگہ اور ہو گئی ویران

ظفر اقبال

غزل

طا کریں نہ کریں ہم ، سزا ضرورت ہے
عاف کیجیے کیوں ، اس کی کیا ضرورت ہے
ہارے پاس سمجھ بوجھ ہے کم نہیں ہے ، مگر
غضب تو یہ ہے کہ اس کے سوا ضرورت کیا ہے
بھی الگ بھی ملاقات ہو سکے جو کہیں
آپ کی ہمیں سب سے جدا ضرورت ہے
وال کر نہیں سکتے ہم آپ سے ، ورنہ
یقین جانیے ، بے انتہا ضرورت ہے
ڑا ہے کہاں سے [illegible] ضرورت ہے
و میں نے پوچھا تو کہنے لگا ضرورت ہے
ا بھی لائیے اسے کہ وہ کب سے
وہاں ہے اور یہاں جا بجا ضرورت ہے

ہوں احتجاج محبت کا اشتہار ظفر
ہے میرے ماتھے پہ لکھا ہوا ضرورت ہے

غزل

نہیں کہ ملنے ملانے کا سلسلہ رکھنا
کسی بھی سطح پہ کوئی تو رابطہ رکھنا
مدد کی تم سے توقع تو خیر کیا ہوگی
غریب شہر ستم ہوں ، میرا پتا رکھنا
مریں گے اور ہمارے سوا بھی تم پہ بہت
یہ جرم ہے تو پھر اس جرم کی سزا رکھنا
نئے سفر پہ روانہ ہوا ہوں از سر نو
جب آؤں گا تو مرا نام بھی نیا رکھنا
حصار شوق اٹھانا ظفر ضرور مگر
کسی طرف سے نکلنے کا راستہ رکھنا

تسلیم احمد

غزل

جو سنے شہرِ زیاں کا ماجرا
بھول جائے اپنے گھر کا راستہ

میں رہا ٹوٹے ہوئے تیغوں کے ساتھ
ہر تعلق نے مجھے زخمی کیا

ٹکڑوں ٹکڑوں میں بسر کرتا ہوں عمر
لمحہ بھر کو جی اٹھا پھر مر گیا

جیسے ہمسائے ہوں میرے شہر کے
خواہشیں باہم نہیں ہیں آشنا

رات بھر پرچھائیوں سے جنگ کی
میرا دشمن ایک مٹی کا دیا

ہم نفس انساں کا کوئی تو ہو
دوست دشمن آشنا نا آشنا

یوں تو دنیا میں سبھی اچھے نہیں
تم تو اچھے تھے تمہیں نے کیا کیا

بے حسی سے مر گئی پہچان بھی
ایک ہے میرے لیے اچھا برا

میں کسی سے کیا وفا کرتا سلیم
میں نے اپنے ساتھ ہی دھوکا دیا

▲

غزل

لوگ مرتے ہیں فائدے پہ جہا
میں نے کھولی وہاں دکاں ز

شبِ آفاق کا چراغ ہے
یہ مرا دل، یہ شعلۂ رفتہ

دوستی، دشمنی، وصال،
ایک لمحے میں ہیں کئی ابر

دل میں شاید کسی کی یاد
شاید آباد ہو کبھی یہ مر

ساحلوں پر سکوت ہے
آج کی رات آئے گا طو

کوئی پوچھے نئے چراغوں
جل بجھے جو دیئے وہ جہاں

دور ایسا بھی آئے گا
ایک ہو گی محبتوں کی

شب کو دیکھا تھا خواب
صبح جاگے تو پھر وہی ز

مجھ سے یزداں کو بھی ا
اہرمن بھی مری طرف

شہر میں تیرے روشنی
گھر میں آئے تو رات تھی

لوگ کچھ دیر آکے ٹھہرے
یہ جگہ اور ہو گئی ویرا

غزل

خطا کریں نہ کریں ہم، سزا ضرورت ہے
معاف کیجیے کیوں، اس کی کیا ضرورت ہے
ہمارے پاس بھی جو کچھ ہے کم نہیں ہے، مگر
غضب تو یہ ہے کہ اس کے سوا ضرورت کیا ہے
کبھی الگ بھی ملاقات ہو سکے جو ہمیں
کہ آپ کی ہمیں سب سے جدا ضرورت ہے
سوال کر نہیں سکتے ہم آپ سے، ورنہ
یقین جانیے، بے انتہا ضرورت ہے
پڑا ہے کب سے یہ [illegible]
جو میں نے پوچھا تو کہنے لگا ضرورت ہے
بلا بھی لائیے اسے کہ وہ کب سے
وہاں ہے اور یہاں جا بجا ضرورت ہے

ہوں احتجاج محبت کا اشتہار ظفر
ہے میرے ماتھے پہ لکھا ہوا ضرورت ہے

غزل

نہیں کہ ملنے ملانے کا سلسلہ رکھنا
کسی بھی سطح پہ کوئی تو رابطہ رکھنا
مدد کی تم سے توقع تو خیر کیا ہو گی
غریب شہر ستم ہوں، مرا پتا رکھنا
مریں گے اور ہمارے سوا بھی تم پہ بہت
یہ جرم ہے تو پھر اس جرم کی سزا رکھنا
نئے سفر پہ روانہ ہوا ہوں از سر نو
جب آؤں گا تو مرا نام بھی نیا رکھنا
حصار شوق اٹھانا ظفر ضرور مگر
کسی طرف سے نکلنے کا راستہ رکھنا

ظفر قریشی

غزلیں

حسن و عشق آج پاس پاس لگے
آئینے سارے بدحواس لگے

خضرِ منزل نے ساتھ چھوڑ دیا
راستے سب اداس اداس لگے

کیوں نہ مانگے زُلال آنکھوں سے
کیا کرے پھر وہ جسکو پیاس لگے

کیا ہوئی وہ ہماری خودداری
ہر دعا اب تو التماس لگے

ابھی پختہ کہاں ہوا ہے شعور
آدمی کیوں نہ بے لباس لگے

غیر کی یاد کو جگہ دی ہے
کیسے دل ان کا، انکے پاس لگے

جسکو دیکھو اخیٔ باطل ہے
کوئی تو فردِ حق شناس لگے

موت بن جائے آدمی کی حیات
ساری دنیا اگر اداس لگے

کیوں تمنائیں ہوں نہ افسردہ
آس کو جب نگاہِ یاس لگے

داد کا شور کیا کہیں طرفہ
ساری محفل سخن شناس لگے

کیا سنائیں قصۂ دیوانگی
وہ تو ہے یارو! نزاعِ خانگی

بزدلی نے اٹھ کے میداں سر کیا
رہ گئی بیٹھی ہوئی مردانگی

وقت جب آیا لگا بے درد بھی
پاس آئی دوڑ کے بیگانگی

منہدم ہیں عقل و دانش کے محل
اب تو دیوانوں میں ہی فرزانگی

کون دنیا کو کرے اپنا حلیف
دشمنی کیسی تو ہے یارانگی

خیر سے دونوں کا مسلک ایک ہے
ساقیوں کی ضد نہیں مستانگی

جل دیئے تھے جتنے طرفہ ہم مذاق
کر لیں حاصل آپ بھی حیرانگی

والی آسی

غزل

بھلا دے معصوم بچوں کی زباں ہو جائینگے
حرف بھی مانیں گے تو ہم اک داستاں ہو جائینگے

میں نے تیرے ساتھ جو لمحے گزارے تھے کبھی
آنے والے موسموں میں تتلیاں ہو جائینگے

کیا خبر کس سمت یہ پاگل ہوا لے جائیگی
جب پرانی کشتیوں کے بادباں ہو جائینگے

یاد آئیگی انہیں کیا کیا ہماری بے حسی
جب ہمارے عہد کے بچے جواں ہو جائینگے

میرے نغمے میری خاطر کچھ بھی ہوں والی مگر
آگ برساتی رتوں میں بدلیاں ہو جائینگے

▲

غزل

بہاریں، اب یہاں آئیں گی، بس کاغذ کے پھولوں کی
نہ بادل گھر کے آئیں گے نہ رت آئے گی جھولوں کی

وہ چہرہ راہ روکے گا، وہ صورت یاد آجائے گی
چبھیں گی زندگی بھر آنکھ میں کرچیں اصولوں کی

کہیں ایسا نہ ہو بھولے ہوئے غم یاد آجائیں
نہ اتنے پیار سے دیکھا کرو تصویر پھولوں کی

سنہرے خواب بن کر اُڑ گئے آشاؤں کے پنچھی
بڑی ہم نے سزا پائی ہیں، چھوٹی چھوٹی بھولوں کی

مری غزلوں کے چہرے پھول جیسے ہیں مگر، والی
مرے احساس میں پیوست ہیں نوکیں ببولوں کی

▲

جدید لب و لہجہ کی ایک منفرد آواز ——— عرفان صدیقی
کینوس شعری مجموعہ قیمت: دس روپے
مکتبہ دین و ادب - امین الدولہ پارک، لکھنؤ

کیف احمد صدیقی

غزل

برف بن کر پگھل گیا سورج
آج کتنا بدل گیا سورج
غنچہ و گل کو خستگی دیکر
اشکِ شبنم میں ڈھل گیا سورج
سات رنگوں کی آگ بھڑکا کر
اپنے شعلوں میں جل گیا سورج
بعض اوقات شام سے پہلے
دوپہری میں ڈھل گیا سورج
سنگ ریزے بھی بن گئے موتی
جانے کیا شئے اگل گیا سورج
پہلے سائے ہی کھائے تھے لیکن
دھوپ بھی اب نگل گیا سورج
اب وہ یخ بستگیٔ فکر کہاں
کیفؔ شعروں میں ڈھل گیا سورج

▲

غزل

جب بہت سرد ہو گیا سورج
اور بیدرد ہو گیا سورج
سارے عالم کو سرخیاں دیکر
کسقدر زرد ہو گیا سورج
اب وہ پہلی سی آب و تاب کہاں
کتنا نامرد ہو گیا سورج
رات کو دے کے اک ہجوم بلا
شام کو فرد ہو گیا سورج
ہر طرف اک غبار تاریکی
راہ کی گرد ہو گیا سورج
اپنا ہمزاد جان کر شاید
میرا ہمدرد ہو گیا سورج
کیفؔ "سورج کی آنکھ"[1] سے دیکھو
"گرد[2] کا درد" ہو گیا سورج

▲

۱ ـ ۲ کیف احمد صدیقی کے شعری مجموعوں کے نام

"جدید شاعری میں بوقلمونی
ایک منفرد فرد کی حیثیت نہ
رکھتی تو ایسا مجموعہ کبھی وجود میں نہ آتا"
شمس الرحمٰن فاروقی

گرد کا درد
کے بعد ـــ کیف احمد صدیقی
کی غزلوں کا دوسرا مجموعہ **سورج کی آنکھ**
قیمت : دس روپے

"سورج کی آنکھ" غزل کا تقریباً ایسا انوکھا مجموعہ ہے جو غزل کی فضا کو وسیع کرتے ہوئے ایک فضا کی غزل کا شاعرانہ جواب ہے ـــ ڈاکٹر بشیر بدر

ملنے کا پتہ : دانش محل امین آباد ـ لکھنؤ

آشفتہ چنگیزی

غزل

خراج شاہ سے اپنا وصول کرتے تھے
تمام دریا اسی شہر سے گزرتے تھے

جنوں کے قصوں پہ بچوں نے ہنسنا چھوڑا
کہاں ہیں لوگ جو جی جان سے گزرتے تھے

خزاں کے پھول اگلنے کا یہ ہنر ہو ہم
بزرگ سا بنے یہ شوق فضول کرتے تھے

تری تلاش میں گھر بار چھوڑنے والے
لہو کا رنگ تری داستاں سے بھرتے تھے

طلوع ہوتا تھا بانگوں سے مرغ کی سورج
پرند پنجروں میں قرآں کا ورد کرتے تھے

عجیب بات ہے کرتے تھے بندگی جسکی
اسے خیال سے باہر بھی لاتے ڈرتے تھے

▲

غزل

تمام شہر سے نظریں چرائے پھرتا ہے
وہ اپنے شانوں پہ اک گھر اٹھائے پھرتا ہے

ہزار بار یہ سوچا کہ لوٹ جائیں گے
نہ جانے کیوں ہمیں دریا بہائے پھرتا ہے

کہ آج تک اسی دھوکے میں سب کے واقف ہیں
جسے بھی دیکھو کوئی شے چھپائے پھرتا ہے

حدود سے تجاوز کی بات کرتا تھا
وہ اپنے سینے میں پودے لگائے پھرتا ہے

▲

باقاعدگی سے ہونے والا دوماہی ادبی رسالہ

الفاظ

چیف ایڈیٹر: ابوالکلام قاسمی

پتہ: دوماہی 'الفاظ' ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علیگڈھ

صلاح الدین ندیم

غزل

گدلے پانی میں نظر آیا نہ چہرہ اپنا
سنگ کھانے گیا آنکھوں کا اندھیرا اپنا
گھر سے نکلے تھے کہ رستوں کے گھنے جنگل میں
گم ہوئے ایسے کہ رستہ بھی نہ پایا اپنا
درد کا چشمہ ہوا خشک تو خاک اڑتی ہے
دل کا آسیب زدہ جسم ہے صحرا اپنا
کالی راتوں میں چمکتا ہے جگنو کی طرح
قافلہ صبح کا جو ہم نے لٹایا اپنا
ہم نے سو رنگ بھرے ذہن کی تصویروں میں
پھر بھی کاغذ پہ کوئی رنگ نہ ابھرا اپنا
بادباں کھول دیے ہیں مگر اب سوچتا ہوں
کوئی ساحل ہے نہ دریا نہ سفینہ اپنا
چہرہ اجڑا ہے تو آئینے کو الزام نہ دو
ہم بھی بگڑے ہیں جو شہر میں چرچا اپنا
چھن گئی ہم سے جو اس روح کی آواز ندیم
لفظ کا شعلہ بجھا، دل بھی نہ دھڑکا اپنا

▲

صمد انصاری

غزل

انا وہ کم عیار صفِ دشمناں میں تھا
احساس تمکنت بھی دلِ دوستاں میں تھا
ہوتی ہے خاک و خوں سے ہر فن کی پرورش
کب حرفِ انبساط مری داستاں میں تھا
شب بھر رہا ہے چاند کے ملنے پہ گرد سی
کل ذکر اس کا انجمنِ مہوشاں میں تھا
فتنہ تھا دل مرے لیے اس کے لیے جمال
وہ شخص بھی تو ساتھ مرے امتحاں میں تھا
دھندلا دیے ہیں آنکھ کو آشوبِ ذات نے
سچائیوں کا عکس تو روئے بتاں میں تھا
ہر سمت ہوں میں اپنی فضا میں رچا ہوا
کل تک ہوا کا رنگ مرے آسماں میں تھا
کرتا ہوں میں اسکی زلف سے دن کو حسابِ شب
اتنا تو حوصلہ مرے عجزِ بیاں میں تھا
چھنے لگا تھا کس کی انا سے نظمِ حیات
کس کے لہو کا زہر زمان و مکاں میں تھا
مامون تھا اس سے کوئی دہر میں صمد
وہ تیرِ بے ہدف کہ جو اسکی کماں میں تھا

▲

دو غزلیں

کاوش بدری

یوں تو ساحل پہ مرا جسم ہے پتھر کی طرح
پھیل جاؤں گا کسی روز سمندر کی طرح

کون سے فرد سے ملتی نہیں صورت میری
ساری دنیا نظر آتی ہے مرے گھر کی طرح

خواب آلودہ ہے ہر منظر خونیں بہار
زندگی آج ہے روندی ہوئی بستر کی طرح

دشتِ اوہام کو گلزارِ یقیں ہونے تک
ہم کو اس دور میں جینا ہے پیمبر کی طرح

پیکرِ سنگ کو پیراہنِ جاں کہہ کر اب
ہم تو پتھرا سے گئے ہیں بتِ آذر کی طرح

چند فنکار کے ہاتھوں میں قلم چلتا ہے
گردنِ زیست پہ چلتے ہوئے خنجر کی طرح

میں بھی اک نسلِ تسلف ہوں مجھ میں بھی کتابیں ہیں ہزار
یاں تو کاوش ہوں کتب خانے میں نوکر کی طرح

▲

نصرت ہاشمی

سورج کی دھوپ سر پہ اٹھاتی رہی ہوا
دیکھو پرائی آگ میں کیسی جلی ہوا

آخر سمیٹنا پڑا پھیلے پروں کا جال
پچھلے پہر خبر بھی ہے کیا کیا چلی ہوا

دستِ ہوس نے توڑا ہے جب سے اک آئینہ
سائے سے اپنے خوف زدہ ہو گئی ہوا

پھیلا ہی جا رہا تھا رگوں میں غمِ نگار زہر
ہنس کر یہ زہر پی گئی اخلاص کی ہوا

دل کے کھنڈر میں اور بھی بھڑکاؤ کچھ الاؤ
ہم کو لگن تھی جلنے — لہو جیسی تھی ہوا

بارے چلے کہ پھر تو رہیں گرم جوشیاں
گھر کی اداس سرد فضا سے ملی ہوا

مہکا گئی جو روح کی تنہائی کا مکاں
وہ دل نوازِ شام رہی ڈھونڈتی ہوا

پیڑوں کی ننگی شاخوں پہ پھل پھول آ گئے
موسم نیا لئے ہوئے پھر آ گئی ہوا

پربت سے نیچے اتری تو خاموش ہو گئی
اپنی ہی طرح نصرت ملی دل جلی ہوا

▲

اجمل اجملی

غزل

وقت سفر قریب ہے بستر سمیٹ لوں
بکھرا ہوا حیات کا دفتر سمیٹ لوں

پھر جانے ہم ملیں نہ ملیں اک ذرا رکو
میں دل کے آئینے میں یہ منظر سمیٹ لوں

غیروں نے جو سلوک کیے ان کا کیا گلہ
پھینکے ہیں دوستوں نے جو پتھر سمیٹ لوں

کل جانے کیسے ہونگے کہاں ہونگے گھر کے لوگ
آنکھوں میں ایک بار بھرا گھر سمیٹ لوں

سیل نظر بھی غم کی تمازت سے خشک ہو
وہ پیاس ہے ملے تو سمندر سمیٹ لوں

اجملؔ بھڑک رہی ہے زمانے میں جتنی آگ
جی چاہتا ہے سینے کے اندر سمیٹ لوں

▲

نازش انصاری

غزل

زمیں پہ آئے خزاں دیدہ سلسلوں کی طرح
کچھ عکس ابھرے اگر ڈوبتے دلوں کی طرح

مجھے تم ہی نے بھرے شہر میں کیا ویراں
تم ہی بساؤ گے اک روز محفلوں کی طرح

مری حیات کے کچھ لمحے مانگ لو مجھ سے
اگر پسند ہو مرنا بھی سائلوں کی طرح

جنہیں ٹھکانا بھی اک عمر تک نہیں آیا
دکھائی دور سے دیتے ہیں منزلوں کی طرح

پرانے پانی کی رغبت سے کب ملے گی نجات
میں زیر آب ہوں برباد ساحلوں کی طرح

▲

کرامت علی کرامت ـــ کے معرکہ آرا تنقیدی مضامین کا مجموعہ
اضافی تنقید   قیمت تیس ۳۰ روپے
شعری مجموعہ "شعاعوں کی صلیب"
ملنے کا پتہ: پہچان پبلیکیشنز ۔ مصدری محلہ ۔ آسنسول

فاروق شفق ★ قمر صدیقی

غزل

بدن کے موسموں میں خون کا پودا ہرا رکھنا
ہوا ہر سمت سے آئے دریچوں کو کھلا رکھنا
چمکتی دھوپ میں آنکھوں پہ یوں شیشہ نہ چمکاؤ
ہمیں معلوم ہے ہر رنگ میں آنکھوں کو وا رکھنا
میں سورج ڈوبنے سے پہلے ہی گھر لوٹ آؤں گا
تم اپنی آنکھوں میں کچھ شام کی سرخی بچا رکھنا
بدلتی رت میں پتھر تک بدل جاتے ہیں ہم کیا ہیں
زیادہ دیر تک مشکل ہے یاں خود کو خفا رکھنا
ابھی کچھ آہٹیں سی جاگتی ہیں دھندلی گلیوں میں
یوں ہی کچھ دیر ابھی یادوں کا دروازہ کھلا رکھنا
گذرنا ہے ہزاروں میل کے صحرا کی منظر سے
شفق کپڑوں کو اجلا اور چہرہ کو دھلا رکھنا

▲

غـــزل

ابھی سے خواب نہ دیکھو بلند ٹیلوں کے
ابھی قیام کہاں، فاصلے ہیں میلوں کے
تمازتوں نے قیامت کا روپ دھارا ہے
ذہانے خشک ہوئے جا رہے ہیں جھیلوں کے
جو ہاں میں ہاں نہ ملائے وہ کامیاب نہیں
یہاں کسی کو نہ جوہر دکھا دلیلوں کے
وہ جن کے خون کی خوشبو رواں تھی خیموں میں
کہاں سے آئیں اب افراد ان قبیلوں کے
نہ پاس وضع نہ کچھ قدر اکتساب ہنر
یہاں تو چلتے ہیں سکے فقط وسیلوں کے
نہیں ہے فرش نشینوں سے رابطہ ان کا
عجیب مزاج ہوئے شہر کے فصیلوں کے
صداقتوں پہ جو مہر حیات ثبت کریں
بھلا وہ گرد بھریں کس لئے وکیلوں کے

▲

برصغیر کا سر فہرست نام
یالی
کے دو شعری مجموعے
"حرف معتبر" اور "حساب رنگ"
ملنے کا پتہ:- پہچان پبلیکیشنز - مصری محلہ - آسنسول

سحر ساجد

غزل

خوف لا حاصلی، اندیشۂ صرصر دونوں
نہ ہوں کر یہ پلے ہیں مرے اندر دونوں

دھوپ کا شور وہاں اور یہاں ہے پایاں سکوت
پیاسے رہتے ہیں سدا دشت و سمندر دونوں

اس سے شاید کہ ہوں کچھ بوجھ دلوں کا ہلکا
آؤ ہم رو لیں ذرا دیر لپٹ کر دونوں

جب کہ مابین مرے اسکے نہیں ہے کوئی
پھر بھی کیوں چونک اٹھا کرتے ہیں اکثر دونوں

یہ جو دو پیڑ نظر آتے ہیں بے برگ و ثمر
اگلے موسم میں یہ جھک جائیں گے لد کر دونوں

سرد ہے رات رگوں میں بھی لہو جم سا گیا
آؤ سو جائیں اکیلے اک ہی اوڑھ کے چادر دونوں

آج ننھے سے نظر آتے ہیں لیکن اک دن
ہو ہی جائیں گے جواں سرو و صنوبر دونوں

لوگ جسموں کو جدا کر کے تھے نازاں جتنے
اتنے ہم ہو گئے یک جان بچھڑ کر دونوں

میرے دل کی طرح حساس بھی کیا ہونگے سحر
یوں تو نازک ہیں بہت شیشہ و پتھر دونوں

▲

غزل

تصدیق ہم نے کر لی ہے چاروں دشاؤں سے
گونجا ہوا ہے دشت ہماری صداؤں سے

کالے دھوپ کی بھیڑ جو نکلی تھی گاؤں سے
آئی تھی ملتے خون کی بو بھی ہواؤں سے

آنکھوں کے سامنے تھا سیاہی کا سلسلہ
نکلا ہوں جب میں روح کی اندھی گپھاؤں سے

کچھ دیر میں وہ شاخ سے ہو جائیگا الگ
کب تک لڑے گا آخر یہ پتہ ہواؤں سے

منظر عجیب میں نے یہ دیکھا ہے خواب میں
آواز دے رہا تھا وہ مجھ کو خلاؤں سے

اندر سے کھوکھلا ہے بہت آج کا بشر
مضبوط دیکھنے میں سبھی ہاتھ پاؤں سے

کیا ہے بس غبار ہوس جانئے بھی ہو
پوچھے تو کوئی آج کی ان اپسراؤں سے

غیرت کا میری کوئی ٹھکانہ نہیں رہا
قاتل بھی میرے ساتھ جو نکلا گپھاؤں سے

سونچ کوئی ضرور ہے غم اور خوشی کے بیچ
اندازہ ہو چلا ہے مجھے دھوپ چھاؤں سے

کاغذ پہ کوئی حشر اٹھاتے چلو سحر
جو لکھا تھے چاند سدا کو قلم کی صداؤں سے

▲

نجم عثمانی

• غزل

بہ برکت لطفِ یار کے بادل برس گئے
اک بوند کے لیے مرے لب پھر ترس گئے
تعبیریں جن کے خوف سے آنسو رلا گئیں
کچھ ایسے خواب اپنی نگاہوں میں بس گئے
ہاتھوں میں دوستوں کے محبت کے پھول تھے
اور میرے سر پہ سینکڑوں پتھر برس گئے
اُف تنگ سے لباس میں بارش میں بھیگ کر
ان شوخ لڑکیوں کے بدن اور کس گئے
زندہ کیا ہمیں نے روایت حسینؑ کی
جب شہر میں یزید صفت لوگ بس گئے

▲

غزل

عروج ہوگا تو اک دن زوال بھی ہوگا
ہمارے زخم کا پھر اندمال بھی ہوگا
وہ جس کی ذات سے قائم ہے شہر کی رونق
اسی کا شہر میں جینا محال بھی ہوگا
ہر اک خیال کا دل ہی میں ٹوٹ جائے گا دم
وہ دور آئے گا شبدوں کا کال بھی ہوگا
مرا ہی جسم ہے ٹھوکر کی زد میں آج، مگر
مرے ہی سامنے دستِ سوال بھی ہوگا
لہو سے دل کے اے نجمؔ اسے سینچتے رہیے
تو فن میں آپ کے پیدا کمال بھی ہوگا

▲

اویس احمد دوراں سے خطاب

● محمد سالم

اے میرے شاعر! مرے محبوب شاعر!
آج بھی درد کا پیکر ہو تم
آہ! آج بھی گائے ہو تم
بربطِ دل پر غم و اندوہ کا نغمہ
ابھی تک تمہارے خواب سارے
زخم خوردہ ہیں

یہ بجا، سراپا سوز ہو تم
آج بھی جلتے ہو سوزِ نہاں سے
آج بھی آنکھیں تمہاری
رنج و غم میں مسلسل ڈوبی رہتی ہیں
جہاں غم کے شرارے
بھڑکتے رہتے ہیں
تم آج بھی گامزن
راہِ وفا پر
آج بھی دامن تمہارا چاک چاک ہے
ہمیشہ تم بھٹکتے رہے ریگِ صحرا میں
سورج کرب کا سر پر ہمیشہ ہی رہا
روح بے لب مضطرب ہو کر سسکتی ہی رہی
سایۂ دیوار کی حسرت ہمیشہ تم کو رہی
کاش! کوئی ہمنوا اس درد کے صحرا میں
تم کو ملا ہوتا

تمہاری آرزو لیکن
پگھل کر خاک میں ملتی رہی
اور سورج خواب کا دوراں نکلنے سے رہا
ہاں تمہارے دل کو بہلاتا رہا اک سراب
یہ بتاؤ پھر تمہاری تشنگی بجھتی کیسے؟
تم تڑپتے ہی رہے
پیاسے ہی تو ہر دن رہے

○

تم فصیلِ فلسفہ سے اب بھی تو نکلو ذرا
کوئی کب سے منتظر ہے
چشمِ دل کھولو سہی
پہچان لو گے تم
کہ ہے وہ کون؟
ایماں ہے مجھے،
اے میرے شاعر!
تمہاری آنکھ سے
چھٹ جائیں گی
غم کے بادل
تھام لو دامن
تجلی سے
منور ہو جائے گا
تمہارے دل کا گھر
تم پھر نہیں بھٹکو گے ۴

۴: کر بول صحرا میں
صدا تشنہ نہیں

اویس احمد دوراں

غزل

یہ پیام دے رہے ہیں مرے عہدِ نو کے آذر
کہ صنم بنیں گے اک دن یہی راستے کے پتھر
بڑا پیارا خواب دیکھا ہے گزشتہ رات میں نے
مرے گلستاں پہ چھایا ہے سہانا سرخ منظر
مجھے یاد ہے ابھی بچپن سے انہی کے درمیاں ہوں
یہی چوٹ کھائے انساں مری فکر کے ہیں محور
مرے دیس کے غریبوں کو جگا رہا ہے کوئی
کہیں بانسری بجا کر تو کہیں غزل سنا کر
وہ ہے کون جس نے لوٹا ہے قرار غمزدوں کا
نہ تمہیں سکوں میسر نہ مجھے سکوں میسر
نہ تمہاری کوئی محفل، نہ مرا کوئی ٹھکانہ
تم اس طرح ہو بے گھر، میں اسی طرح ہوں بے گھر
کسی حکمراں کا شاید یہ نیا محل بنا ہے
ترے نور کو چرا کر، مری شمع کو بجھا کر
ترا نغمہ عیش و مستی، مرا گیت سوزِ ہستی
تو ہے منعموں کا مطرب، میں ہوں غمزدوں کا شاعر
یہ ہے اداس اداس گیسو یہ پھٹے پرانے آنچل
کب اثر کریں گے دوراں مرے شاعرانہ دل پر

غزل

اک بھینی بھینی خوشبو ہے، اک نور فضا میں پھیلا ہے
پھر کوئی گلستاں مہکا ہے پھر کوئی ستارہ چمکا ہے
اے دیدہ ورو! اے تشنہ لبو! آ جاؤ مرے ہمراہ چلو
میری ہی تمنا کا رستہ منزل کی طرف لے جاتا ہے
دیوار پرانی ہے ڈھا دو آواز یہ دیتا پھرتا ہوں
اس عہد کا میں اک باغی ہوں تو مجھ کو شاعر کہتا ہے
آپس میں سبھی ہم ملتے ہیں، مل جل کے ترانے گاتے ہیں
یہ کس نے کہا اس دنیا میں جو فرد بھی ہے وہ تنہا ہے
تھک جاؤ گے تم سنتے سنتے بہتر ہے کہ جاؤ سو جاؤ
ہم جیسے دکھی انسانوں کا یہ قصہ بے حد لمبا ہے
یہ رسم ابھی تک باقی ہے، یہ ظلم ابھی تک جاری ہے
جو بوتا ہے مٹ جاتا ہے جو عیش کرے پھل پاتا ہے
گیسوئے حبیب و شامِ غزل دونوں کی تمنا کس کو نہیں
لیکن وہ تمنا کس کی کرے جو بھوک سے بیکل رہتا ہے
ہم لوگ بھی کتنے سادہ ہیں، ظالم کی بھی عزت کرتے ہیں
وہ صدر بنا ہے محفل کا مظلوموں کو جس نے لوٹا ہے
پیاسوں کی بپھرتی فوج لئے ہاتھوں میں نئی شمشیر لئے
ساقی کا عدو یعنی دوراں میخانہ کے پاس آ پہنچا ہے

کیف انصاری

غزل

لاش سورج کی افق سے جب اٹھا دی جائیگی
آسمانوں پر صفِ ماتم بچھا دی جائیگی

ایک دن مل جائے گا گنجان بن کا بھی پتہ
جنگلوں کو سر پھری وحشی ہوا دی جائیگی

بے خبر ہوتی نہ کرتا میں اجالوں کی دعا
اشک بھر کر میری آنکھوں کو ضیا دی جائیگی

شب کو اصلی رنگ دنیا کا عیاں ہو جائیگا
جو کبھی ہے دھوپ کی چادر ہٹا دی جائیگی

مت کرو پلکوں پہ آ کر احتجاج اے آنسوؤ
اور بھی میعادِ قیدِ غم بڑھا دی جائے گی

سر پہ ہوں گی اسکے بچے غموں کی گٹھریاں
اس طرح تجھکو بلوغت کی سزا دی جائے گی

جیسے جیسے کیف گھٹتی جائیں گی سانسیں مری
ویسے ویسے عمر بڑھنے کی سزا دی جائے گی

▲

بیتاب عالم

دشوار زندگی کا سفر ہے تو مجھے کیا
بے نور حسرتوں کی سحر ہے تو مجھے کیا

اپنی حیات غم کے جہنم میں کٹ گئی
خلدِ بریں وہ تیرا نگر ہے تو مجھے کیا

میں جل رہا ہوں آج بھی سورج کی تپش سے
تیری گلی میں کوئی شجر ہے تو مجھے کیا

جب شہرِ آرزو مرا کھنڈرات بن گیا
آباد کائنات اگر ہے تو مجھے کیا

بیتاب برگِ گل پہ بھی شعلہ بہ لب ہوں میں
وہ شہر جنتوں کا نگر ہے تو مجھے کیا

▲

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ صادق کی شاعری کی بنیاد علامہ پہچان کیا ہے تو میں "احتجاج" کہونگا۔ عتیق اللہ
عبید شعری ادب کا ایک اہم نام

صادق کے دو شعری مجموعے
"دستخط" ــــ اور ــــ "سلسلہ" قیمت دس روپے
ملنے کا پتہ :- پہچان پبلیکیشنز۔ معصوم محلہ۔ آسنسول ۲

ناظم سلطانپوری

★ غزل

نہ جانے کتنے اندھیروں کے درمیاں وہ شخص
سنا رہا تھا اجالوں کی داستاں وہ شخص

بڑے تپاک سے اک آشنا سی دستک پر
کواڑ کھول کے دیکھا مگر کہاں وہ شخص

ہجوم نے غور سے دیکھا تو مثالِ تنہا سا
بہت اداس تھا پھولوں کے درمیاں وہ شخص

طلسمِ عہدِ تمنا کی بات کیا کہیے
کبھی یقین سا لگے اور کبھی گماں وہ شخص

حوادثِ غمِ دوراں سے بے خبر ہو کر
سجائے بیٹھا تھا خوابوں کا اک جہاں وہ شخص

شکارِ ظلمتِ شب ہو کے بھی یہ کیا کم ہے
ہزار پہلو سحر کا ہے رازداں وہ شخص

شکستگی میں بھی ہر اک ادا سے لگتا تھا
کسی زمینِ محبت کا آسماں وہ شخص

جو سن سکو تو خموشی کے غار میں ناظم
ہے اپنے شہر کی روداد خوں چکاں وہ شخص

▲

★ غزل

بیٹھے ہوئے تھے دو شخص جبیں سے ناؤ میں
جانے کدھر گئے وہ ہوا کے بہاؤ میں

یارو ستم تو یہ ہے کہ میری طرح سے آج
وہ بھی سلگ رہا ہے انا کے الاؤ میں

یوں ان سے استوارِ وفا خوب ہے مگر
ڈرتا ہوں پھر بگاڑ نہ ہو اس بناؤ میں

لمحوں کا کچھ قصور نہیں ہے حیاتِ شوق
مارے گئے ہیں ہم تو ترے رکھ رکھاؤ میں

اب واپسی کی راہ نہ پاؤ گے عمر بھر
ناظم نکل پڑے تو ہو گھر سے تاؤ میں

▲

حرفِ آگہی
مجموعۂ کلام
ناظم سلطانپوری • قیمت دس روپے
ملنے کا پتہ: پہچان پبلیکیشنز۔ معتدی محلہ۔ آسنسول

عین رشید

ابن النصیر انور

صنف شاعری میں صرف نظم نگاری سے تعلق رکھنے والے اردو شعراء کی تعداد نہیں کے برابر ہے۔ صرف نظم تخلیق کرنے والے شعراء اپنے اندر کی دنیا میں ایک بڑا ہنگامہ رکھتے ہیں، انکی نگاہوں کی رسائی ارد گرد کے تمام چھوٹے بڑے اچھے برے حادثات و معاملات تک ہوتی ہے۔ ان کی فکر کا آئینہ دار برے حالات کے اظہار میں بے باک ہوتا ہے۔ اردو کے بہت سارے شاعر ایسے ہیں جن کی تخلیق کے سوتے نظموں میں پھوٹتے ہیں لیکن خواہ مخواہ انھوں نے غزل سے رشتہ جوڑ رکھا ہے۔ ایسے شعراء میں عمیق حنفی، باقر مہدی، شہریار اور عادل منصوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۶۰ء کے بعد ابھرنے والوں میں ایک خالص ادبی شاعر عین رشید بھی ہیں۔ عین رشید نظموں کی تخلیق میں بڑا زبردست کمانڈ (command) رکھتے ہیں۔ اردو رسائل میں شائع شدہ نظموں کے مطالعے سے ان کے بے پناہ مشاہدوں اور تجربوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ آج کے عہد کی کربناکی اور افسردگی انکی نظموں کے پیکر ابھرتی ہیں۔ آج کی زندگی کی بے یقینی، ہر لمحہ فریب، دھوکا، لاقانونیت کی بیماری، انسان کا اپنے آپ سے کٹا ہوا ہر رب دعدد کا شدید احساس، جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار اور انسان کا اپنا کھوکھلا پن اور اکیلا پن یہ سب عین رشید کی نظموں کے خاص موضوعات ہیں۔

اردو شاعری میں آزاد اظہار و ابلاغ کیلئے ہمارے شعراء نے جو طریقہ ایجاد کیا ہے اب وہ بڑے زور و شور سے چل پڑا ہے، نثری نظم لکھنے والوں کی ایک بھیڑ روز بروز بڑھتی جارہی ہے لیکن اس بھیڑ میں چند چہروں کی پہچان آسانی سے ہوجاتی ہے۔ عین رشید کا چہرہ ان میں نمایاں نظر آتا ہے اور جب وہ موضوع کے ساتھ سامنے آتے ہیں تو انکے چہرے کی شناخت میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ انکے نزدیک ہیئت کی کم، موضوع کی زیادہ اہمیت ہے جو آج کی شاعری کا خاصہ ہے۔

عین رشید کی نظموں میں موضوع کے اظہار کا بڑا سچا خلوص ملتا ہے، ان کے احساسات کی سچائی، کیفیات کی درون بینی اور تاثرات کی ہمہ گیری، قاری کے ذہن و دماغ میں اٹک جاتی ہے اور لمحہ فکریہ دیتی ہے ان کی نظم کا ایک ٹکڑا ملاحظہ فرمایئے۔ اظہار کا کھرا پن ہمارے ذہن پر ہتھوڑے برساتا ہے اور سوچنے کی ترغیب دیتا ہے۔

شہر میں تیری دیوانہ کن خواہشوں سے بیزار ہوں / شہر تو اپنے گندے لباس کب اتارے گا؟
شہر لوگ کہتے ہیں، مرنے کے بعد میری ہڈی سے بٹن بنیں گے / شہر تیری دیواروں پر یہ کیسی
تحریریں ہیں! / شہر میں نے مہینوں سے اخبار نہیں پڑھا / شہر تو میلے میں شکر ڈالتا ہوں کیکھیے
آنسوؤں کی طرح لگ رہا ہے / شہر مجھے نیند آرہی ہے، تو مجھے کر سلادے۔!

اردو کے شعری ادب کی یہ خوش قسمتی ہے کہ عین رشید جیسا ذہین، باصلاحیت اور حساس نظم نگار ملا۔

عین رشید

نظم

ہر رات
اک ہجوم
پاؤں میں بیڑیاں ڈالنے کو بیقرار
ہر رات
بیڑیاں پاؤں نگل جاتی ہیں
صرف ــــ بائیں کو حرکت کی اجازت ہے
دایاں ــــ بیڑیوں میں محفوظ ہے
بیڑیوں میں پاؤں کو کتنا سکون ملتا ہے
اگر بیڑیاں پاؤں نہ نگلیں تو؟
ان سروں کا کیا ہوگا جو پاؤں کے بل کھڑے ہیں؟

نظم

اس موسم میں یہاں صرف خداؤں کی بود و باش ہے
جو سرخ ہواؤں اور چنگھاڑتی دھوپ کی زبان سمجھتے ہیں

گھیرے میں گام زن دھوپ
وفا کی طرح ہمارے گھروں اور خوابوں میں پھیل گئی ہے
ہر طرف سائیں سائیں کرتی تاریکی ہے
حدِ نگاہ تک
پلکوں پہ لرزتے ننھے قطروں کے سوا کچھ بھی نہیں

دور
تاریکیوں کی ہمسائیگی میں
پالتو اور نیم وحشی کبوتر
فنِ نامہ بری سیکھ رہے ہیں
تاریکی اور حرارت سے مانوس آسیب زدہ لوگ
برق خور کووں کی آواز کے منتظر ہیں

بیمار گڑیا ــــ

کہ شاید خزاں چھو گئی ہے اسے
آج خاموش ہے ــــ مل کے دیکھیں نہیں پھر آج زیرِ دل
ایک معصوم خواہش کی شدت نہ ہو
پھر کسی ادھ جلے خواب کی جستجو تو نہیں
تتلیاں سبزہ و نیلی ــــ سرپھرے رقص و لو کے جھانسے
کتنی مانوس و سرشار ہیں ــــ اور میں اپنے اچھے خدا سے
کتنی بیزار ہوں، تھک گئی ہوں ــــ چوٹیوں پر پہنچنے کی خواہش
چاند تاروں کو چھونے کی خواہش
ایک بے نغمہ بے ساز وحشت ــــ دل دھڑکنے سے بھی ہچکچائے
صورت دود سایہ گریزاں
نیلی تاریکیوں سے شگفتہ
قہقہے مارتی جو میں نکلی
میرے خوابوں کے بیدار چہرے
سارے ساحل پہ نوحہ خواں تھے

حبیب الرحمٰن کوثر — عشرت بلیاب

جدید شاعری کی توضیح و تنقید میں اتنے صفحات سیاہ کئے گئے ہیں کہ اس کی پہچان مشکل ہو گئی ہے۔ ہمارے نزدیک شاعری میں "جدیدیت" یا جدید دراصل عصری حیثیت کو لہجے کی انفرادیت (یا انفرادی لہجے) میں سمونے کا نام ہے۔

لہجے کی انفرادیت ہی ایک شاعر کو دوسرے سے الگ کرتی ہے اور شاعر کی شناخت میں مدد دیتی ہے۔ شاعر کی آوازیں مختلف ادوار میں گڈمڈ کیا رہی ہیں لیکن "لہجے کی انفرادیت" ہی تو یقیناً وہ آواز نمایاں رہے گی گذشتہ تین دہائیوں میں فی الحقیقت گنتی کے شعراء اپنی انفرادی آواز رکھتے ہیں۔ نظم نگاروں میں عمیق حنفی، بلراج کومل، قاضی سلیم، محمد علوی، ندا فاضلی، شہریار، محمود سعیدی، مظہر امام، زبیر رضوی، کمار پاشی اور عادل منصوری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کچھ شعراء ہیں جنہوں نے اردو نظم نگاری کو ایک انفرادیت عطا کی ہے۔ اس کاروان میں الگ اپنی دنیائے شاعری لیے ایک نام حبیب الرحمٰن کوثر کا ہے۔ جدید شاعری کی بہت ساری خصوصیات ہیں یہ ایک خصوصیت انکے لہجے کی انفرادیت ہے جو حبیب الرحمٰن کوثر کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے

جدید شاعری کیلئے جس شعور، احساس اور ذہن کی ضرورت ہے جس سے لہجے کی انفرادیت پیدا ہوتی ہے جدید شاعری جسے ہم جدید حسیت کی شاعری بھی کہتے ہیں، جدید حسیت دراصل آج کے فرد کی اپنی ذاتی فکر اور اپنے عہد کے مزاج کی ہم آہنگی کا نام ہے۔ ایک ایسا عہد جس کا انسان اپنی سوچوں میں الجھا تو ضرور ہے لیکن غور و فکر میں آزاد ہے جو آج کے انسانی رشتوں میں جذبۂ محبت کی کمیابی کا احساس کرتا ہے تو دوسری جانب خلوص و پیار میں گہرائی کا متلاشی ہے حبیب الرحمٰن کوثر کی شاعری بھی صحیح معنوں میں جدید حسیت کی شاعری ہے۔ انکی شاعری کیفیات، تاثرات، احساسات کا شاعری ہے، انکی نظموں میں آج کے عہد کی بے یقینی، تشویش اور فقدانِ احساسِ سلامتی بار بار ابھرتی نظر آتی ہے۔

آج کی مصروف ترین زندگی میں انسان اپنے مسئلوں میں زندہ ہے، آج کا سب سے اہم مسئلہ جینے کا مسئلہ ہے۔ ہر لمحہ تشکیک، ناامیدی، احساسِ اذیت سر اٹھائے ملتی ہیں اور انسان اپنے کو اس دائرہ میں محصور پاتا ہے لیکن اسکے اندر کی چیخیں بدستور نکلتی جاتی ہیں (چاہے وہ چیخیں گلے میں اٹک کر ہی کیوں نہ رہ جاتی ہوں) یہ چیخیں اور آوازیں احساسِ کرب و درد کے لہجے کی انفرادیت کے ساتھ نکلتی ہیں، اور ہمیں یہ سمجھنے میں قطعی دشواری نہیں ہوتی کہ یہ چیخیں یہ آوازیں جو اپنے اندر سمندروں کی کیفیات رکھتی ہیں، حبیب الرحمٰن کوثر کی شاعری کی ہیں۔ انفرادی لب و لہجہ میں احساسات کی DEPRESSION کا مکمل اظہار ان آوازوں میں نہایت ہی سے ملتا ہے۔

... انفرادیت ہے جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہے

(حبیب الرحمٰن کوثر کی شاعری پر ایک مفصل مضمون شائع کریں گے)

سلاسوئی

ہنستے، روتے یا مسکاتے
کچھ غمگیں اور کچھ گھبراتے
اجلے، کالے، لال اور پیلے
چنچل، شوخ اور کچھ چمکیلے
کچھ دھندلے، مرجھائے، بےکل
کچھ بےحس، بیمار اور بوجھل

چہروں کے ہر میلے میں، میں
اپنا چہرہ ڈھونڈ رہا ہوں
بستی بستی گھوم رہا ہوں

▲

ایک کلیہ

یہ کلیہ ہے کہ ہر شے
کمی سے اپنی بڑھاتی ہیں قیمتیں ہر دم
چلو نہ ہم بھی اسی نہج پر زمانے میں
وفا، خلوص و محبت کا انبار کرنا
کہ اب بہت کم کسی سے پیار کرنا

▲

سلاکاہ

"دن" سفید ہاتھی ہے
"رات" کالی ناگن ہے
"صبح" طائرِ خوش رنگ
"شام" خوں بلب ڈائن
آدمی پریشاں ہے گھر کے ان بلاؤں میں

▲

"رشتہ گونگے سفر کا" (شعری مجموعہ) • مظہر امام • قیمت دس روپے
ملنے کا پتہ :۔ شب خون کتاب گھر، ۳۱۳ رانی منڈی۔ الٰہ آباد

محب الحجاز کوثر

★ یومُ العذاب

افق سے تا بہ افق
اک دھواں دھواں سی فضا
عجیب سناٹا — غضب کی تیز ہوائیں
کہیں پہ سے کے پرے شعلہ بار ہیں عفریت
کہیں ہجوم ابابیل سنگ زن پیہم
کہیں یہ آہنی "رولوشا" برسرِ پیکار
کہیں اڑا تو اڑا کاہ کی صفت یہ کوہ
کہیں بہا تو بہا مثلِ آتشِ سیال
کہیں تو برف کا میداں بن گیا جم کر
کہیں یہ گیس کی دنیا میں کھو گیا دریا
کہیں وہ شور کہ شرمندہ صورِ اسرافیل
کہیں کچھ ایسی خموشی کہ بس خدا کی پناہ
نہ شائبہ ہی خوشی کا نہ خوف کا احساس
ہر ایک چہرہ ہے بے چہرگی کا آئینہ
نہ شورِ طوق و سلاسل نہ قید و بند کی بات
حیات مردہ ہے اور موت ہے بقیدِ حیات

▲

★ زندگی ایک دُشنام

زمیں! میں تجھے چھوڑ کر جا رہا ہوں
افق سے پرے
اک بہت خوبصورت جہاں ہے
جہاں میرا محبوب جلوہ فگن ہے
جہاں ساری آسائشیں، راحتیں ہیا
مگر
زندگی کیلئے
سب سے زیادہ اہم اور لازم
بہت ساری آسائشوں، راحتوں سے زیادہ
حسین، کیف زا، نغمہ پرور
ایک " فرقت کا غم "
جب نہ ہوگا، تو پھر "زندگی"
روح کی تازگی سے تہی
ایک " دُشنام " ہو جائے گی

▲

نجم عثمانی
کا شعری مجموعہ " شمارِ نفس "
بہت جلد منظرِ عام پر آرہا ہے
"پہچان" پبلیکیشنز - معصدی محلہ - آسنول

زبیر رضوی

خطائے بزرگاں

پرانی بات ہے
لیکن یہ انہونی سی لگتی ہے
ہوا اک بار یوں
ان کے بزرگوں نے
زمیں میں کچھ نہیں بویا
فقط انگور کی بیلیں اگائیں
اور مٹی کے گھڑوں میں مے بنائی
رات جب آئی
وہ سب مدہوش تھے
ان کے بدن ننگے تھے
پہلی بار
مے کا ذائقہ ہونٹوں نے چکھا تھا
حکایت ہے
برہنہ دیکھ کر اپنے بزرگوں کو
جواں بیٹوں نے آنکھیں بند کر لیں
اور مٹی کے گھڑوں کو توڑ ڈالا
صبح سے پہلے
زمیں ہموار کی
اور اس میں ایسے بیج بوئے
جن کے پھل پودے
کبھی ان کے بزرگوں کے نہ کام آئے!

▲

پرندے لوٹ آئے

پرانی بات ہے
لیکن یہ انہونی سی لگتی ہے۔
ہوا اک بار یوں
بستی کے باغوں میں
کسی بھی پیڑ کی ٹہنی پہ کوئی پھل نہیں آیا
ہرے پتوں کا موسم لوٹ کر واپس نہیں آیا
پرندے رو دیے
اور دور کے باغوں میں ہجرت کر گئے سارے
بہت آزردہ ہو کر باغبانوں نے
دعائیں کیں
مناجاتیں پڑھیں
اپنے گناہوں کی
خدائے لم یزل سے بارشیں مانگیں
درختوں کی جڑوں کو ڈھیر سا پانی دیا
اور کیاریاں کاٹیں
ہرے پتے کا موسم لوٹ کر نہیں آیا
پرندے لوٹ آئے تھے
نئی بستی کے باغوں سے
ہرے پتے کی ٹہنی توڑ لائے تھے

▲

ثروت حسین

گیت کے ایک کنارے پر.....

..... گیت کے ایک کنارے پر میں، دوسری جانب رنج، خوشی
اور خوابوں کی آزادہ زمینیں، گیت کے رخ پر کھلنے والے
دروازوں پر چڑھتی بڑھتی، بیلوں کی پیچیدگی میں
ایک اک کر کے کھلتے تارے، گیت کنارے دھوپ، مویشی
اور مگن مکھو جھونپڑیوں میں جلتے چولہے، کھیلتے گرد اڑاتے
بچوں کی مٹ میلی صبحیں، شامیں، میٹھی نیندوں کی برکھا
سے جل تھل، جیسے دور دراز جگہوں سے بہتے بہتے
آ گرتے ہیں گیتوں میں گیتوں کے دھارے .....

▲

اسی دالان بھر تنہائی کی حد پر .....

..... اسی دالان بھر تنہائی کی حد پر ستاروں کی ہوا سے
گفتگو کرتے گزرتے، صبح کے ہمراہ مٹی کے پیالوں پر اترتے
گھونٹ بھرتے، دھوپ ریزہ ریزہ اور کالے بادلوں کی
دھجیوں میں شام کرتے، ادھ کھلے حجرہ دانوں سے سیراب
آئینوں کے رخ پر سرمئی شمعیں جلاتے دیکھنا اور
بھول جانا ....

▲

سلیم شہزاد

الٹے قدموں کا سفر

شہر الٹے قدموں
کالے غاروں
کالے جنگلوں کی سمت
واپس جا رہا ہے
جنگلوں سے شہر تک،
صدیوں سے یہ پھیلا فاصلہ
اب الٹے سفر کے قدموں میں گھٹ گیا ہے
میں جنونِ جولاں
گرد لئے بے سروپا
اک سفر صحرا کی وسعت میں اکیلا
الٹے قدموں بھی چلوں
تو ابتدا اور انتہا کے فرق سے واقف ہو نہ پاؤں
کہ میں اک نقش
دھیرے دھیرے
جس کی سب لکیریں مٹ رہی ہیں

▲

صلاح الدین پرویز

ابتدا

ہوا پریشاں، نیند شب میں
مکاں حیراں، بے سبب میں
زمیں قائم، زماں رفتہ
سکوت سکتہ صدا میں نقطہ
ادھر سے جنتِ خواب لاتی
ادھر سے بختِ خراب لاتی
کدھر سے آتی کدھر کو جاتی
سلسلہ شب لازوال باقی
سپید دن بے مثال ساقی

▲

حمید سہروردی

پانی پانی لمحے

پانی پانی لمحوں میں
کیا کیا سوچیں ہوتی ہیں
چاند تارے دونوں ہاتھوں میں
دھرتی اپنی ہوتی ہے
پانی پانی لمحوں میں
دیواریں اور دروازے
کھڑکیاں اور روشن دان
چلتے پھرتے ہیں
پانی پانی لمحوں میں
تیری میری ہر حرکت
ایک نیا طوفان ہوتی ہے
پانی پانی لمحوں میں
کتنا اچھا لگتا ہے
پانی پانی لمحوں میں

▲

تتلیاں

یہ ہیں زرد تتلیاں
میرے من کی طرح
دیکھ کر ارد گرد اڑتی رہتی ہیں اکثر
کیوں وہ دور دیس کو جاتی نہیں
کیا وہ ایک پُر آشوب منظر کی ہیں منتظر
ان سے کہہ دو ذرا
اب کوئی ایسا لمحہ آئے گا نہیں
یہ ہیں زرد تتلیاں
میرے من کی طرح

▲

زخم دل ہرا ہرا
(شعری مجموعہ)
(مضطر عظیم آبادی)
قریب از اشاعت
محرک پبلیکیشنز اسٹور ڈیو چھایا - ہاٹن روڈ - آسنسول ۱۳۳۰۱، ۷

حمید سہروردی

درد کی بستیاں

شام جانے کہاں کھو گئی
آنکھ کے سامنے اندھیرا تھا
خونی، قاتل ہیں لمحے یہاں
آئینہ کس طرف ہو گیا
میں نے دیکھا نہیں
دیکھتے ہی دیکھتے دھواں ہی دھواں
سارا کمرہ میرا ویران تھا
شام جانے کہاں کھو گئی؟
درد کی بستیاں اونگھتی رہ گئیں
کچھ تو کہو ——
بے خطر بے خوف اڑتے ہوئے جگنوؤ!
ایک ایک لمحہ گرا
پانی بنا
صورتیں منجمد ہو گئیں
میری تیری صورت نہیں
یہاں کوئی بھی نہیں

▲

شبدوں سے پرے

رات جب بھی چھٹکتی ہے
تو کچھ سوچتی ہو گی
تیرے شبستاں میں
سپنوں کا اژدھام دیکھ کر
تیرے نازک ہونٹ
اور بڑی بڑی
اور پھیلی ہوئی آنکھیں
اور تراشے ہوئے ناخن
سبھی شبدوں سے پرے
کچھ تو کہتے ہی ہوں گے
رات بھی سوچتی ہو گی ——

▲

مغربی بنگال کی پیشکش

"اردو افسانے کا سفر"
نمائندہ افسانوں کا انتخاب مع تعارف

مرتب: عشرت بیتاب

بہت جلد منظر عام پر آرہا ہے۔

پہچان پبلیکیشنز —— مصری محلہ —— آسنسول ۲

فرحت قادری

آواگون

میرا کیا ہے
چلا جاؤں گا!
تم مگر
بچ نہ سکو گے
محبت بھری نگاہوں سے ـــــ!

▲

رات کا سورج

کارپوریشن کے نلکوں سے
سڑکوں سڑکوں
کب تک اپنی پیاس بجھاتا ـــ؟
آج میں اپنے آنگن میں
واٹر پمپ لگا رہا ہوں ـــــ!

▲

رات کا سورج

میرے گھر کا سورج
جب شام کو نکلتا ہے
گھر تو ہوتا ہے تاریک
شہر جگمگاتا ہے ـــــ!

عہد حاضر کے ادب کی ایک اہم دستاویز
ترتیب :۔ براج مینرا
شرودت
تین مکمل کتابوں کے ساتھ

فوٹو آفسیٹ طباعت

پانچ سو صفحات
قیمت پانچ روپے

تقسیم کار
مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دلی، دہلی، علیگڈھ، بمبئی ـــ

تقسیم کار
انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر، راؤز ایونیو
نئی دہلی

ارمان شام نگری

سرخ انگارہ

سلگتا سورج
یخ بستہ ناصر کو
گھنٹوں
حدت پہنچاتے پہنچاتے
جب
انگارہ بن چکا
تو
لہریں مارتے ہوئے
سمندر میں کود پڑا
اور تھوڑی دیر کیلئے
معصوم مناظر کو
لہولہان کر دیا

سیلاب

خونخوار آنکھوں کا
سیلاب
جسم چہروں کے
معصوم
عضو عضو کو
ٹکڑے ٹکڑے کرکے
تنکے کی طرح
بہا رہا ہے

نکتے

الفاظ کو
ب کی
ضرورت
محسوس ہوئی
اور
نکتے پیدا
ہونے لگے

بادل

ابر رسانی کے
بادل
امرت
برسایا کرتے تھے
مگر اس سال کے
بادل
بس
کے قطرے
برسا رہے ہیں

اردو غزل کو زندگی عطا کرنے کی کامیاب کوشش

زخم صدا

از ظفر افضل

تنویر پبلیکیشن، ۹۸ لورچیت پور روڈ، کلکتہ ۱

داستان رامپور کا ایک اہم فنکار

میر غلام علی عشرت بریلوی

مرتبہ: ڈاکٹر احمد سجاد

گہوارۂ ادب — طارق منزل — بریا تو رانچی

غالب

ڈاکٹر عبدالرؤف

ڈاکٹر محمد اقبال نے مرزا غالب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا "

گلشن ویمر کا تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے" ۔ ویمر جرمنی میں ایک مقام کا نام ہے جہاں جرمنی کا عظیم ترین شاعر اور ادیب گوئٹے مدفون (۱۷۴۹ تا ۱۸۳۲) ہے۔ جرمن ادب اور فلسفے کا جائزہ لیتے ہوئے کارل مارکس نے اپنے ایک مضمون میں اسی گوئٹے کو عظیم ترین جرمن کے نام سے یاد کیا ہے۔ گوئٹے کوئی سیاسی رہنما نہیں بلکہ ایک شاعر و فنکار تھا۔ کارل مارکس نے زبان اور فن کا احترام کرتے ہوئے جسکا تعلق براہ راست انسان اور انسانیت ہوتا ہے گوئٹے کو "عظیم ترین جرمن" کہا ہے۔ غالب کا شعورِ زبان و فن ایک آفاقی معیار رکھتا ہے لہٰذا ہم اسے ایک ہندوستانی کی حیثیت دیتے ہیں بالکل حق بجانب ہیں۔ غالب فارسی کے ایک باکمال شاعر تھے۔ گذشتہ سات سو سال کے عرصے میں ہندوستان نے جن عظیم فارسی گو شعراء کو (جن کی تعداد چار پانچ سے زائد نہیں) جنم دیا ہے ان میں سے ایک غالب بھی ہیں۔ لیکن اسکے باوجود اگر انہوں نے صرف فارسی شاعری پر اکتفا کر لیا ہوتا اور اردو کو اپنا خون جگر نہ پلایا ہوتا تو آج یوم غالب کا اس طرح اہتمام نہ کیا جاتا جس طرح کبیر داس اور تلسی جی ہندوستانی روایات کی سنہری لہریں ہیں جو ہندوستان کی فضا میں تیر رہی ہیں۔ غالب بھی اسی طرح ہندوستان کی لہر بنتا جا رہا ہے جسے ملک کی فضا میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس نے ہندوستان کی عظیم روایات کو اپنے اندر جذب کیا تھا جس کے صلے میں ہندوستان اپنی ذات میں سموتا رہے گا۔

شاعر انسان اور انسانیت سے قریب ہوتا ہے اور دراصل یہی قرب انسانی کا نام عظمت ہے۔ ایک شاعر اور عام انسان میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ دونوں کے درمیان ایک چھوٹی سی حد فاصل ہوتی ہے اور یہ کہ شاعر میں قوت اظہار ہوتی ہے اور عام لوگوں میں یہ قوت نہیں ہوتی ورنہ جہاں تک جذبات کا تعلق ہے اس میں ساری انسانیت ہم آہنگ ہوتی ہے۔ ساری انسانیت کا دل ایک ساتھ دھڑکتا ہے اسی نکتہ نظر کو مدنظر رکھتے ہوئے غالب نے کہا تھا ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا　　میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

وہ فطرت انسانی کا نباض تھا ٹھیک سعدی شیرازی کی طرح جس نے اپنی حکایتوں میں انسان کے ان گنت روپ بتائے۔ غالب نے اپنے شعروں میں انسان کے ان گنت جذبات کو پیکر بخشنے کی کوشش کی۔ سمندر کی لہریں اور انسانی جذبات کی لہریں دونوں کی تعداد کون بتائے۔ غالب نے ان لہروں کو گننے کی جسارت کی تھی۔ اسکے دیوان میں مضامین کا تنوع اس جسارت کی کچھ تفصیل پیش کرتا ہے۔ سازِ بے وجود کے بیشمار تاروں کو اپنی دسترس میں لانے اور انہیں چھیڑنے کی کاوش میں اس نے ایک عمر صرف کی۔ دراصل اس کی شاعری ہی جگر کاوی سے عبارت ہے۔

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب　　خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

غالب کا عہد عظیم تبدیلیوں کا عہد تھا۔ ان تبدیلیوں کی نوعیت عارضی نہیں تھی۔ یہ انقلاب ہوا کا کوئی جھونکا نہیں تھا کہ آیا اور گزر گیا۔ سیاسی اور معاشی شکست و ریخت کے ساتھ ذہن اور نظریوں کی پرانی دیواریں گرنے لگیں روایات اور عقاید کی کہنہ فصیلوں میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ ملک نے اپنے آپ کو ایک ایسے ماحول میں پایا جس کیلئے وہ تیار نہیں تھا۔ ان تبدیلیوں کے پس منظر میں ۱۸۵۷ء کا خونیں انقلاب تھا جسکو ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کے نام یاد کرتے ہیں۔ ماحول غم و مایوسی کی لہروں میں بہہ رہا تھا۔ غالب کی شاعری میں ان خارجی اثرات کا گہرا اثر ملتا ہے۔ ذہنوں کی تبدیلی اور کشمکش کی ایک تصویر ملاحظہ فرمائیں ؎

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر — کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

غم جو انسانی سرشت کی تہہ میں ہوتا ہے وہ غالب کی شاعری کا محرک ہوا۔ شخصی اور اجتماعی انتشار و استبداد نے انہیں غم کی طرف متوجہ کیا۔ ان مضامین کی رفعت میں جذبات غم کو بڑا دخل ہے۔ ان کی شاعری میں حافظ شیرازی کی شگفتگی اور رعنائی نہیں ملے گی۔ شہپر غم انہیں بلندیوں تک لیجاتا ہے جہاں فارسی شاعری بمشکل تمام پہنچے گی۔ حالانکہ اردو شاعری فارسی کی دست نگر اور مقلد رہی ہے۔

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا — میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے غالب انسانی نفسیات کے بڑے ماہر اور نباض تھے۔ سرشت انسانیت سے مطابقت پیدا کرنے کیلئے انہوں نے مختلف النوع اشعار کہے جن میں معنی و بیان کے حسن کے علاوہ صوتی نکات بھی رکھ دیئے گئے ہیں۔ جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق؟ — ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

صاف ظاہر ہے کہ غالب بزم میکدہ سے رخصت ہو چکے ہیں۔ ساقی اہل میکدہ کو بار بار آواز دیتا ہے "کوئی ہے جو مردوں کو پچھاڑ دینے والی اس شراب کو پئے"۔ جب کوئی جواب نہیں ملتا تو حسرت زدہ لہجے میں کہتا "کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق" یعنی اہل بزم میں ایک بھی مے خوار نہیں جو آگے بڑھ کر جام کو تھامے۔ شعر میں ایک ڈرامائیت پیدا ہو گئی ہے ؎

خاکبازی امید کارخانۂ طفلی — یاس کو دو عالم سے لب بخندہ درباں (نسخۂ حمیدیہ)

"یاس" طول امل گرفتار نہیں ہوتا وہ دونوں عالم کو بچوں کے کھیل کی جگہ سمجھتا ہے۔ جہاں بچے ایک دوسرے پر دھول پھینکتے ہیں جس طرح ہنستے وقت ہونٹ علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ یاس دونوں عالم سے بیگانہ رہتا ہے۔ لطف یہ کہ لفظ "یاس" کا تلفظ کرتے وقت منہ کھلا رہتا ہے۔ دونوں منہ یا ہونٹ نہیں ملنے پاتے۔

غالب نے اپنی شاعری میں یہ پیام دیا ہے کہ یہ عالم بے معنی نہیں ہے۔ اگر اس کی تہوں تک نظر نہ پہنچ سکے تو کم از کم اس کی صورت ظاہر پر ضرور نظر رکھنا چاہیئے۔

عالم آئینہ راز است چہ پیدا چہ نہاں — تاب اندیشہ نداری بہ نگاہے دریاب

یہ کائنات بظاہر اور بباطن راز کا ایک آئینہ ہے اگر اس کے معنی کی تہوں تک نہیں پہنچ سکتے تو کم از کم اس کی

شکل پر نظر تو ڈالو ؎

گر بہ معنی نہ رسی جلوۂ صورت چہ کم است — خم زلف و شکن طرف کلاہے دریاب

اگر معنی تک نہیں پہنچتے تو کم از کم صورت تو ملاحظہ کر لو۔ خم زلف اور کلاہ کی شکن یعنی طرحداری کیا کم ہے۔ اپنے ایک اردو شعر میں بھی مفہوم کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

نہیں گر سر و برگ ادراک معنی — تماشائے نیرنگ صورت سلامت

معنی تک پہنچنے کی طاقت نہیں صورت کی نیرنگی تو دیکھی جا سکتی ہے لہٰذا دیکھو ؎

بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالب — چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

کلکتہ غالب کو خاص طور پر یاد رہے گا کیونکہ انہوں نے کلکتہ کو خاص طور پر یاد رکھا اور والہانہ انداز سے اپنے کلام میں اس کا ذکر کیا اپنی پنشن کی بازیابی کے سلسلے میں وہ کلکتہ آئے اور تقریباً ڈھائی سال قیام کرنے کے بعد دہلی واپس آگئے۔ اگست ۱۸۲۶ء وہ دہلی سے کلکتہ کیلئے روانہ ہوئے اور ۲۸ر نومبر ۱۸۲۹ء کو دہلی واپس آئے۔ اس سفر نے غالب کو ذہنی طور پر متاثر کیا جس کی نشاندہی ان کے کلام سے کی جا سکتی ہے۔ جس وقت وہ یہاں آئے کلکتہ ہندوستان اور یورپی تمدن کا سنگم بن رہا تھا۔ اس وقت ان کی عمر کوئی ۳۲ ۳۳ برس کے قریب ہوگی۔ کلکتہ انہیں پسند آیا تھا۔ اپنے شعروں میں انہوں نے اس کا ایک مرقع پیش کیا جسے آج بھی دیکھ کر ہم خوش ہو جاتے ہیں۔

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں — اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب — وہ نازنیں بتان خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر — طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازۂ شیریں کہ واہ واہ — وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

▲▲▲

اردو ادب کے صنف تنقید میں ایک اہم اضافہ

تلاشِ معیار

ادبی مقالات کا مجموعہ

(ڈاکٹر عبدالرؤف) — قیمت: دس روپے

ملنے کا پتہ: یہیان پبلیکیشنز۔ مصاری محلہ۔ آسنسول ۲

اردو افسانہ کی ایک اہم آواز ــــ بلراج مینرا

■ ڈاکٹر شمیم حنفی

نئے افسانے کے کینوس پر بلراج مینرا کے نام کا نقش خاصے شور شرابے کے ساتھ اور گرد سے اٹی ہوئی فضا میں ابھرا ہے، عرصہ ہوا، اس کی پیشانی پر اردو کے ایک سابق افسانہ نگار نے بدنام زمانہ یمینیت کی تختی آویزاں دیکھی اور اس سوال سے بے تعلق ہو کر کہ وہ اچھا یا برا ادیب یا لکھنے والا ہے۔ اسے سی آئی اے کا ایجنٹ قرار دیا۔ پھر چند برس پہلے مین را نے پیاسا اور یک رخی جدیدیت پر طعنہ زنی شروع کی تو ایک حلقے سے یہ آواز اٹھی کہ وہ انتہا پسند ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے اسے تہمت کی ان دونوں وادیوں سے گزرتے ہوئے دیکھا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ سوائے ان موقعوں کے جب کسی مباحثے میں اس کی آواز کا شعلہ تھوڑی دیر کیلئے تند و تیز ہو گیا، عام طور پر وہ مجھے پرسکون اور اس بارش سنگ سے بے خوف اور بے نیاز نظر آیا۔ اس نے جس خاموش اعتماد کیساتھ پہلے دائرے کو بکھیرا تھا اسی قلندرانہ خود گرفتگی کے ساتھ دوسرے دائرے کی دیوار بھی منہدم کر دی۔ ایک کہانی لکھنے والے کی حیثیت سے وہ کسی کھلاڑی کیطرح ہوا میں تیرتا ہوا اور پھر باہم متضاد تعصبات کی منزلیں سر کرتا رہا۔

دوسروں کے بارے میں وثوق کیساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا، البتہ میں نے ایک عام قاری کی حیثیت سے مین را کو بطور افسانہ نگار بغیر کسی پس و پیش کے قبول کرنے کے باوجود اس کی فکر کے اسلوب کو بڑی مشکل سے انگیز کیا ہے۔ ایک ایسے لکھنے والا جو خیال کی کسی ایک لہر میں مدغم نہ ہو سکے اس قاری کیلئے مسئلہ سمجھا جاتا ہے جو چھوٹے بڑے ہزار تعصبات کی الجھن میں گرفتار ہو۔ پس مین را بھی میرے لئے ایک مسئلہ بن گیا۔ کبھی اس کی آواز میں مجھے اپنی آواز کا سراغ ملا اور کبھی اس کی صدا کے سائے کو میں نے دشمن نگاہ سے دیکھا۔

مین را نے کوئی ناول نہیں لکھا، کوئی طویل کہانی بھی نہیں لکھی، قیاس یہ کہتا ہے کہ اگر اگر ایسا کوئی ارادہ کیا بھی تو اس کا انجام لوشن کی کہانی "دیوانے کی ڈائری" جیسا جگر لخت لخت کی صورت ہوگا یعنی عام قصوں اور ناولوں کی تنظیم، ترتیب اور ربط سے یکسر عاری۔ کچھ اکھڑا اکھڑا لہجہ اور کہنے سے زیادہ ان کہی باتیں کی قوت ترسیل میں یقین کی صورت مین را کی کم و بیش تمام کہانیوں سے جھلکتی ہے۔ گفتگو کا ایک طور خاموشی بھی ہے سو مین را بھی اپنے جملوں کی انضباط غیر استدلالی ترتیب اور مروجہ لسانی تلازمات سے گریزاں الفاظ کے درمیانی وقفوں میں اظہار کا جوہر بھر دیتا ہے۔

میں اپنی الجھن پر قانع ہوں اور اس وقت سے ڈرتا ہوں جب مین را اپنی الجھنوں کے جنجال سے نکلنے میں کامیاب ہو جائے۔

▲

بہ جمیں سا ـــــ ظلمت

اُس نے کندھے جھٹکے ـــ پیازی رنگ کی ساری کا پلو بائیں کندھے سے پھسل گیا اور بازو اوپر اٹھ گیا، بازو جو چست بلاؤز میں کسی ہوئی چھاتیوں کے نیچے ننگے پیٹ پر دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے ـــ مرکز میں میری آنکھیں پھیلنے لگیں ـــ وہ میری اور بڑھ رہی تھی، دھیمے دھیمے نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی، سفید قمیص، سفید بلاؤز، سفید اسکرٹ، سفید موزے، سفید سینڈل، گورے گال، گورے بازو، گوری پنڈلیاں ـــ

میرے ہونٹ ـــ

میرے ہونٹ سوکھ گئے ـ پیازی رنگ کی ساری کا پلو اس کے بازوؤں میں تھما ہوا تھا۔ بازو جو چست بلاؤز میں کسی ہوئی چھاتیوں کے نیچے ننگے پیٹ پر دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے۔ میرے دانت ـــ

میرے دانت بھنچ گئے ـــ وہ میری اور بڑھ رہی تھی۔ دھیمے دھیمے نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی سفید بلاؤز، سفید اسکرٹ، گورے گال، گورے بازو، گوری پنڈلیاں ـــ میرا حلق

میرا حلق کانٹا ہو گیا ـــ ننگے پیٹ پر دائیں بائیں پھیلے ہوئے بازو گر گئے تھے۔ پیازی رنگ کی ساری کا پلو فرش پر آن پڑا تھا۔ چست بلاؤز میں چھاتیاں کسی پڑی تھیں ـــ میرا جسم

میرا جسم پھنکنے لگا ـــ وہ میرے قریب آ گئی تھی، نپے تلے قدم، سفید اسکرٹ، گوری پنڈلیاں

میرا دم ـــ

میرا دم گھٹنے لگا ـــ اس کی گردن تن گئی۔ بازو انگڑائی کو اٹھ گئے ـ پیازی رنگ کی ساری کا پلو فرش پر تڑپ رہا تھا، ننگا پیٹ دمک رہا تھا، چست بلاؤز میں کسی ہوئی چھاتیاں پھڑپھڑا رہی تھیں۔ بلاؤز کے اوپر کے بٹن کھل گئے تھے ـــ میرے سانس ـــ

میرے سانس کھنچ گئے۔ میرے ہاتھ بڑھے، میں نے اس کی کمر تھام لی اور میں عقاب کی سی تیزی سے جھپٹا اور میرے ہاتھ اس کے کولہوں کو نوچ رہے تھے ـ "آج تمہیں کیا ہو گیا ہے"۔ پیازی رنگ کی ساری فرش پر پڑی تھی۔ بلاؤز دروازہ کے قریب پڑا تھا اور میں نے

"..... مجھے تمہاری ضرورت ہے" اس کے کولہوں کا گوشت سخت تھا اسے نوچا نوچ لیا، گال، ہونٹ، گردن چھاتیاں اور اس نے مجھے نوچ لیا ـــ اور میں

میں نے اس کی اسکرٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا ـ "تم بیمار ہو .... اتنی تیزی خطرناک ہے" ـــ اس کی چھاتیوں میں منہ چھپائے ہانپ رہا تھا۔ اس نے میرا سر اپنی چھاتیوں میں چھپا لیا اور میں اس کی بازوؤں میں سو گیا۔ صبح جب میری آنکھ کھلی، تھکن کے مارے میری بری حالت تھی ـ اور میں بیمار تھا ـــ مجھے کیا

مجھے کیا بیماری تھی، مجھے علم نہیں۔ یہ جسم میرے قابو میں نہیں تھا اور میرے ذہن کی باگ ڈور بھی میرے ہاتھ سے
چھوٹ چکی تھی۔
مجھے شدید احساس تھا کہ میرے جسم اور ذہن کی باگ ڈور میرے ہاتھ سے چھوٹ چکی ہے ـــــ شاید یہ احساس
ہی میری بیماری تھی جسے ڈاکٹروں نے نہ جانے کیا نام دیا تھا اور کہ ڈاکٹروں نے میرے احساس کو کسی بیماری کا نام دیا تھا۔
میں جنرل وارڈ کے اسٹاف روم میں کئی دن سے پڑا تھا۔
اسٹاف روم کی مشرقی کھڑکی کے میلے شیشوں کو چیر کر پیلی دھوپ میری تھکی تھکی ٹانگوں پر پڑے
ہوئے سرخ کمبل پر پھیل گئی۔ اور ایک مانوس آواز نے کہا۔ "گڈ مارننگ اسٹاف".... گڈ مارننگ.....
میں نے اس کی اور دیکھا۔ اب میرے احساس کو کسی بیماری کا نام دے دیا گیا تھا، میں نے آنکھیں بھینچ کر کڑوی دوا حلق
میں انڈیلی اور آنکھیں کھول کر پھر اس کی طرف دیکھا۔

"کیسے ہیں آپ"... ؟
"میں نے کہیں آپ کو دیکھا ہے، آپ کی آواز کہیں سنی ہے ـــــ آپ کی آواز میرے ٹھنڈے بدن میں...
مجھے شدید احساس تھا کہ الفاظ کے پرندے اب میرے جال میں نہیں پھنستے۔

"آپ کو کیا ہو گیا ہے"
"میں نے یہ آواز کہاں سنی ہے.... ؟ اُف ف ف " میرے لب کانپنے لگے میں نے آنکھیں بند کر لیں
میرا دل ڈوب گیا۔
میری پلکیں گری ہوئی تھیں۔
میری گری ہوئی پلکوں کی اُس اور پیلی دھوپ کا ایک تراشہ میرے پاؤں میں سرخ
میں پڑا تھا اور میری گری ہوئی پلکوں کی اس اور میری نظروں کے سامنے ملگجی روشنی میں وہ ننگے بدن ساحل
سمندر پر ٹہل رہی تھی۔
سمندر شانت تھا۔
موجیں دھیمے سروں میں اجنبی جزیروں کا گیت گا رہی تھی۔ وہ مدہوش تھی اور ننگے پاؤں ساحل سمندر پر ٹہل رہی تھی
ساحل سمندر میری نظروں کے سامنے کمان کی طرح پھیلا ہوا تھا۔
وہ میری نظروں کے سامنے یوں کھڑی ہو جاتی کہ ساحل سمندر نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور پھر یوں لیٹتی، دھیمے
دھیمے قدم اٹھاتی کہ ساحل سمندر کے خط واضح ہونا شروع ہوتے اور وہ دور، بہت دور، ننگے بدن کی
ایک مختصر سی لکیر بن جاتی کہ میں اسے اپنی انگلی سے ناپ لیتا وہ پھر پلٹتی، دھیمے دھیمے قدم اٹھاتی
میری اور بڑھتی۔ اس کا ننگا بدن لیشوں سا تھا، بدن کے کچھ رنگ گیتی تھے، بال سنہری تھے، آنکھیں سمندر تھیں
نظریں شانت موجیں تھیں۔ تنی ہوئی گردن غرور تھی ـــــ اور اس کی چھاتیاں

نہ جانے اسے کیا سوجھا، کیا محسوس ہوا، وہ لیکی اور سمندر میں کود گئی — میری نظروں کے سامنے پھیلے ہوئے ساحل سمندر پر آگ کی بہت بڑی کمان جلنے لگی — میں جل گیا، میری آنکھیں جل گئیں۔

"آپ کی سرخ آنکھیں ہیں"

"آپ کی آنکھیں بھی تو سوجی ہوئی ہیں"

"میں تمام صبح سو نہ سکی"

"آپ صبح سوتی ہیں؟"

"نہیں — ! رات پر ڈیوٹی پر تھی"

"آپ کہیں کام کرتی ہیں!"

"آپ نہیں جانتے — ؟"

"نہیں!"

"میں اسی ہاسپٹل میں کام کرتی ہوں اور نرس ہوں اسی وارڈ میں ڈیوٹی پر تھی اور......"

"اور؟"

"اور آپ کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا"

"آپ مجھے پہچانتی ہیں؟"

"نہیں"

"آپ نے میری اسکرٹ نوچ ڈالی تھی اور......"

"ذرا دروازہ بند کر دیجئے"

"آپ بیمار ہیں...... تیزی آپ کی خطرناک ہے..."

"پھر — ؟"

"آپ نے مجھے پہچانا؟"

"اپنی پنڈلیاں دکھا دیجئے تب شاید پہچان سکوں"

"اوو گاڈ"

"آپ کون ہیں؟ — جانیئے"

"اچھا...... یہ رہی میری پنڈلیاں —..."

"ہاں کل رات تم یہیں ڈیوٹی پر تھیں...... مجھے تمہاری ضرورت ہے"

"تم بیمار ہو...... اتنی تیزی خطرناک ہے"

"سنو، جن ہوتے ہیں نا ان کی جان پرندوں میں ہوتی ہے، ان ننھے پرندوں کو کھانے پینے کیلئے کچھ نہ ملے تو

تو مرجاتے ہیں اور بعض بھی مرجاتے ہیں "۔

" تمہاری باتیں میری سمجھ میں بالکل نہیں آتیں "

" آپ کی پنڈلیاں بڑی اچھی ہیں "۔

" میں تمہیں پیار کرتی ہوں "

" میں آپ کو نہیں جانتا... ہاں!
آپ کی پنڈلیاں ..... "

اس نے میرے ہاتھ اپنے گلابی ہاتھوں میں تھام لئے

" تمہارے ہاتھ برف ہو رہے ہیں "

اگلے لمحے لبِ دیگرے میری دائیں بائیں ہتھیلیاں چوم لیں

" تمہارے ہاتھوں کی حرارت کہاں گئی..... ؟

اس نے مجھے گلابی رنگ کا سوپ گہری پلیٹ میں ڈال کر دیا

" تمہیں ٹماٹر کا سوپ اچھا لگتا ہے " نا

" ٹماٹروں کے سوپ میں خون کی نمکین لذت ہوتی ہے "

کیسی باتیں کرتے ہو ـ "

تمہارے پاس پیازی رنگ کی ساری ہے ؟

" اب یہ کیا بات ہوئی ؟ "

" تمہارے پاس پیازی رنگ کی ساری ہے "۔؟

" نہیں "

" پھر یہ سب کیسے ہوا.... ؟

کیا کیسے ہوا..... ؟

" یہی کہ تم.... کہ تمہارے کندھے جھکے تھے۔ تمہاری پیازی رنگ کی ساری کا پلو بائیں کندھے سے پھسل گیا تھا اور تمہارے بازوؤں میں ختم گیا تھا تمہارے بازو جو تمہارے حسبِ بلاؤز میں کسی ہوئی تمہاری چھاتیوں کے نیچے تمہارے ننگے پیٹ پر دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے ...

" میری آنکھیں..... "

" تمہیں کیا ہوگیا ہے ؟ "

" مجھے کیا ہوگیا ہے ؟ "

" میں نے پیازی رنگ کی ساری پہن رکھی ہے "۔

" میرے پاس آؤ میں تمہیں چھونا چاہتا ہوں "۔

" نہیں "

" میں تمہیں چھونا چاہتا ہوں "

" نہیں ! نہیں !! نہیں !!! "

" حقیقت اور خواب، روشنی اور اندھیرے، ماضی اور حال ــــ سب گھل گئے۔ پھر پگھلا ہوا ایک آہنی سانچے میں ڈال دیا گیا اور میں کہ میرا ایک ماضی تھا، حال تھا، میری کچھ حقیقتیں تھیں، کچھ خواب تھے، میں روشنی بھی تھا، اندھیرا بھی، یوں مٹ گیا کہ نشان تک نہ رہا۔ اب میں ایک کھلونا تھا۔ جذبات سے عاری، احساسات سے عاری ــــ صبح ہوئی، شام ہوئی اور پھر رات اور پھر نیند ــــ پھر صبح۔ پھر شام اور پھر رات اور پھر نیند ــــــــ
آہستہ آہستہ صبح، شام، رات اور نیند آگے پیچھے ہونے لگے۔ روشنی اور اندھیرے کی سرحدیں مٹ گئیں اور صرف نیند رہ گئی ــــ

ہزاروں دن بیت چکے ہیں کہ ساں، میں نہیں جانتا اتنا جانتا ہوں کہ لوگ کہتے ہیں، میرا جسم میرے قابو میں ہے اور میرے ذہن کی باگ ڈور میرے ہاتھوں میں ہے لیکن پیازی رنگ کی ساری والی اور سفید اسکرٹ والی لڑکیاں کہہ رہی ہیں۔

" تمہیں کیا ہوگیا ہے، تم خاموش کیوں رہتے ہو ــــ کیا تمہیں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا ؟ "

ہمارا ادبی تعمیری کیمپ

حسین الحق

(گفتگو اور تحریک کی دو انتہاؤں پر بیٹھے دانو کے نام)

میرے تمام اطراف میں قہقہہ لگاتی ہوئی بے حیا
رات بکھری پڑی ہے۔
وقت لامکانیت میں رقصاں ہے اور میں
بیچ سڑک پر تڑپ رہا ہوں۔ لگتا ہے پھر بھی
وہ آگیا ہے ـــــ
پہلے بھی وہ یونہی پریشان کرتا رہا ہے، اکثر چپکے
سے آنکھوں میں در آتا ہے، پنڈلیوں میں سرسراتا ہے
بھلا! پریشان نہ کرو تو قہقہے لگاتا ہے۔
یوں سالا جیون ارکات گذرتا چلا جا رہا ہے۔
اے بیکار عبث انجام پر تم خوش ہو سکتے ہو، میرا کیا، میں
سمندر کی لہر ہوں، آج یہاں کل وہاں، اپنی سوچوں
پر بار بار قابو پانا چاہتا ہوں لیکن سارا منظر اکیدم سے
میگھ مند ہونے لگتا ہے، آنکھیں میچتا ہوں، آنکھیں
کھولتا ہوں، بند کرتا ہوں لیکن سب کچھ گھپلے کا
شکار ہے۔ سمت اور لمحے کا یہ گھپلا مجھ کو لے ڈوبا لگتا
ہے صبح ہے یا شاید رات ہے۔ قہقہہ لگاتی ہوئی بے حیا رات

کوڑھی، اندھا.... دھبہ دھبہ بدن!
سوچتا ہوں چلو تو پوچھو تم کون ہو؟
(میں کون ہوں؟)
پہچان کا مسئلہ شاید بہت اہم یا شاید اتنا ہی معمولی
ہے کہ میں کہ میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔
(میری پہچان مجھ میں گم یا مجھ سے الگ!)
نہ دیکھو، سنبھلو، شکوے شکایت نہ کرو، بیتے آنچو وہ بہت!

میرا تذکرہ فضول نہ سمجھو کہ کتابوں کے اوراق شکستہ ہو چکے ہیں
لیکن الفاظ فضاؤں میں زندہ ہیں، ممکن ہو تو کبھی راہوں
کو اس جانب بھی ملتفت کر دینا کہ سمندر کی لہریں یہاں بھی ہیں
اور وہاں بھی ـــــ
یہ سڑک جہاں میں تڑپ رہا ہوں اس کے کاغذی نقشے میں تلاش
کرنا فعل عبث ہے پیارے کہ کل بھی وقت لامکانیت کے حصار
میں رقصاں تھا اور آج بھی چاروں طرف ڈیرے ہیں، بیکار عبث لمحوں کا
انجام پریشانی ہے۔
راستہ طویل اور خاردار ہے ورنہ تمہیں اکثر دکھاتا کہ پیشانی
پر سپیدی آنے لگتی ہے۔ جذبات کی بات اب نہ کرو، وہ
دوسرے لمحے تھے جن کو ہم شب تنہا کہتے، اب کیا کہوں؟
اور کیا لکھوں؟! آخری سرحد قریب ہے، چاہتا ہوں ایک بار
تم ملو تو ساری روداد تمہارے سامنے بیان کروں کہ پہلے بھی
میری بہت ساری امانتوں کے امانت دار رہے ہو، تمہارے
پاس میرے بہت سارے لمحے رہن ہیں۔ اس دیرینہ شناسائی
کا خراج نہ سہی، صدقہ ہی ادا کر دو ـــ

اب تو بہت ساری باتیں لکھتے ہوئے بھی کچھ عجیب سا لگتا ہے
کل یہ ساری باتیں کیسی طلسماتی تھیں۔ تمہارا مستقبل
اور میرا مستقبل، معیار کا فرق ہونے کے باوجود معنی دونوں
کا ایک ہے، اب سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے، کیسی بچکانہ باتیں
تھیں وہ سب، ایک زمانے میں کیسی رعنائی کا عالم تھا
گویا میں پتھر ہوں، لہریں گذرتی تھیں، دائیں بائیں،
اوپر نیچے، اغل بغل، ہر جانب سے پرشور دریاؤں کا گذر....

اور یہ فیصلہ کہ اس ریلے میں اور تم ..... جاوداں مستقل
تنہا پتھریلا ذہن ایک جانب نگراں ، میں پتھر
صفت انسان ... اندھے روشن ھنوس جیسے ... جیسے
یا رہ بل (بعد میں) آرگس کی مثال بھی دی ..... میں
تنہا بھلا کس سے پوچھوں ! یہی پتھر بہتر ہے یا
رنگ بدلتے صبح و شام .... (کل یوم ھو فی الشان)
دم گھٹتا ہے الفاظ کی کساسائی کا ملبوس نہ دو
دعا انگلیوں کے بیچ نرگل کے درخت کی طرح رہتا تھا
خانہ رہتا کہ اب میرا دم گھٹ جائیگا۔
شکوہ کسی سے بھی نہیں ، دراصل یہ سب کچھ
یوں ہی چلتا رہتا ہے نامردی ، ساری کائنات
ڈھونگ ہے ساری تخلیق جھوٹ ہے ساری تربیت
اپنے ہونے اور نہ ہونے کا یقین ، ہاں اور نہیں
کے حصار کا قیدی ، مر جاؤں تو دعا بھی نہ کرنا ، زندہ
رہوں تو پوچھنا بھی مت کہ ہم ہی کو ڈھونڈتے ، سارا
جیون برباد گذر گیا سارا لمحہ ، یہ سوچا بھی نہیں
کہ پھر شیو سب (دیکھے کہہ دوں کہ سچ ہے سب جھوٹ)
کیسے کیسے نوکیلا نیزہ بکھیرتے ، گرم گرم چوسیلی
قربان ، یہ طلائی دیوار ، سیاہی دہان تک گردن
اندر سرطرح چھپتا ، تلملاتا سورج ، شانہ بہ شانہ
تمہارا قدم ....

" میرے تمام اطراف میں بے حیا رات بکھر گئی ہے
اور میں تڑپ تڑپ کر ٹوٹ رہا ہوں اور ٹوٹ
ٹوٹ کر تڑپ رہا ہوں
لگتا ہے پھر وہ آ گیا
لگتا ہے تمہارے سارے پھول اپنا سینہ کھو دو سا
کیسے کیسے خواب آنکھوں میں تہہ تہہ بھرتے تھے ،

ساری صبحیں اور ساری شامیں روشن تھیں ، بند کمرے میں چند
پنچھی دن بھر سر ٹکراتے ، جیسے لذت ، جب رات گہری سیاہ ہو
جیسے بچے بکھرے کے اس رقصاں ، پاریک سا بعد میں ، کبھی
یہاں کبھی وہاں ....
کبھی یہ کامیاب کبھی وہ ناکامیاب ، لہجے کی لکنت پہ جب تک
قابو نہ پا سکو تو مجھے دھوکہ نہ دینا ، میں تو سارے میں آج بھی خوشبو
کی طرح پھیلا ہوا ہوں ، کتنے دنوں مجھ سے انکار کرو گے ؟
میں نے کل بھی بہت کچھ سہن کر لیا اور آج بھی کروں گا۔
لیکن گواہ رہنا کہ میرے ساتھ چلنے والوں نے مجھے دھوکا دیا۔
آج جب میں یہاں تنہا بالکونی پر کھڑا ہوں اور شرک
چہرے پہ میرا چھوٹ اور لمحوں میں ڈھل رہا ہوں تو بار بار
اسی احساس پہ میں جیتا ہے کہ ساری حقیقتیں افسانہ بنتی جا رہی ہیں
تمہاری گھمنڈ کی لازوال حقیقت ، بچا کچھ بھی نہیں
صرف چند ادھ لمحوں اور صبحوں کی امانت ، میں انہیں
کب تک سنبھال کر رکھ سکوں گا ؟
اور اب جب میری تنگ دو کی ساری روداد اندھے رستے
کی مسافر بن چکی ہے تو تم کہتے ہو " اپنا ہاتھ دو "
" بھاگ جاؤ ..... جھوٹے پاکھنڈی ... مجہول روایتوں
کے مجہول امین تم نے ہی یہ سارا گھپلا پھیلایا ہے ..... تم نے
ہمیشہ مجھے بیوقوف اور قلاش بنایا کمینے ..... تب بھی
جب گلی گلی ہر بانسوں پر گردنیں بلند ہوتی تھیں اور اب
بھی جب میں یہاں تنہا کھڑا ہوں اور تڑپ رہا ہوں
اور چیخ کر دیے جیسی رات یا کوڑھی دن بکھرا پڑا ہے اور وقت
لامکانیت کے حصار میں لرزاں اور پریشاں ہے۔
تم نے ہمیشہ انکار کیا ، آج بھی انکار کر دو گے تو کوئی نئی
بات نہیں ہوگی بلکہ آج اس کے زیادہ امکانات ہیں کہ
میں آج بھی زمین پر ہوں اور تمہیں کرسی نصیب ہوگئی ہے۔

لیکن تم کب تک بچتے رہو گے دوست!
ان سارے لمحوں اور برسوں کے انجام سے تم نے آنکھیں موند لی ہیں.... موند لو لیکن تحسین کا ہی مقدر رہیگا کہ ازل سے میں ہی سرخ رو رہا ہوں، تم پھر میرے پاس آؤ گے، دھوکا کتنے دنوں تک تمہارا آستانہ بنے گا، اب بچنا مشکل ہے پیارے، پھر وہی لہولہو لمحوں اور رستوں پر بکھرے ہوئے سپنوں کی کہانیاں سرخ رو ہو رہی ہیں .... اب تم ہی افسانہ ہو، نہ سکو گے! لیکن میں کیا کروں؟

سمندر کی لہر تو ازل سے یونہیں مضطرب اور پریشان رہی ہے۔ وہی بے نام و نشان سڑک، وہی ٹکڑے ٹکڑے .... سالم سالم .... کچھ ٹوٹا، کچھ بکھرا ہیں، اور میں بے حیا رات کا قہقہہ اور کوڑھی بدنما، دھبہ دھبہ دن!
میں تڑپ رہا ہوں کہ لگتا ہے وہ آگیا ہے (یا آنے والا ہے؟) اور سارے میں بدبودار ہواؤں کا رقص جاگا ہے۔ میں تڑپ رہا ہوں (یا شاید تڑپتے تڑپتے ساکت ہو گیا ہوں) تم پھر مجھے دھوکا دینا چاہتے ہو لیکن اب کے میں تمہیں جانے نہیں دوں گا نادیدہ احساس کی پروردہ ہواؤں کی سوگند! تم میرے پورے وجود پر بھی چھا جاؤ تب بھی میں تمہیں اپنے آپ سے جدا کر سکتا ہوں کہ لحظہ لحظہ جدا ہوتے ہوئے آسمان کا رنگ میری میراث بنیں۔ میرے آباؤ اجداد نے جو ورثہ چھوڑا ہے وہ میری ساری کائنات ہو کر بھی کچھ تمہاری دنیاؤں کی سیر کا مسئلہ ٹھہرا تو یارو! مر جاؤں تو مجھے چوراہے پہ ملتبار کرنا اور منادی کروا دینا کہ یہ حشر ہے اس کافر کا جس نے مسلمات سے انکار کیا اور بیتے موسموں کی گرد کو اپنی پیشانی کی صندل بنانے سے انکار کیا۔

تو اے مجہول روایتوں کے مجہول امین! اب کیوں تڑپتے ہو، خوش ہو جاؤ کہ یہی تو تمہاری تمنا تھی ہیولا میں ڈھل جانے کے بعد سڑکوں پر اگر دعاؤں کا رقص جاگا ہے تو سجدہ کرو کہ دیوتا زمین پر اتر آئے ہیں اور سنو کہ یہ سارا کچھ جھوٹ ہے، ڈھونگ ہے، فریب ہے اور یہی لازوال حقیقت ہے جو منسوخ کرتی ہے پچھلی ساری حقیقتوں کو.... لہٰذا آج سے دربدر ہو کے چلو رقص کرو اپنے اطراف اور سجدے کرو اپنی پشت پر کہ لحظہ لحظہ جدا ہوتے ہوئے اور بے رنگ ہوتے ہوئے آسمان کا رنگ اب کسی میراث بنیں ....
....
یا شاید سب کی میراث ہے ———

▲

ادب کے جدید میلانات کا ترجمان
ماہنامہ
شب خون
ترتیب و تہذیب
شمس الرحمٰن فاروقی
پتہ: شب خون ۳۱۳ رانی منڈی، الٰہ آباد

سمندر کا آئینہ

• عبدالمتین

میں محوِ سفر تھا اور وہ ہم سفر تھی۔ مگر ہر قدم اٹھانے کے بعد مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میرا پہلا قدم ہے۔ اس طرح میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ سامنے دیکھا تو راستہ ختم کیا اور ایک عظیم سمندر رواں تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو راستہ غائب تھا اور صرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ مجھے اس کی فکر نہیں تھی کہ میں کہاں ہوں؟ بلکہ مجھے یہ خیال ستا رہا تھا کہ وہ کہاں ہے ہم دونوں ساتھ چلتے تھے قدم بہ قدم شانہ بشانہ..... مگر وہ کہاں رہ گئی؟ بھول رہ گئی ہا پھر ہم دونوں ملیں گے یا نہیں؟ اگر ملیں گے تو پھر جدا کیوں ہوئے ـــ یا الٰہی ماجرا کیا ہے؟

سمندر بپھر پڑا اور اس کی موجیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے پہاڑ کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور اس کی حیثیت ایک جزیرہ کی سی ہو گئی، جہاں میں تھا۔ پھر چاروں طرف عظیم سمندر پھیلا ہوا تھا اور میں تنہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ سمندر کا غیض و غضب کم ہوتا گیا اور سمندر پرسکون ہو گیا۔ بالکل آئینہ کی طرح خاموش اور غیر متحرک..... اور اس میں دیکھا کہ وہ ہری بھری گھاس پر محو خواب ہے۔ اس کا چہرہ بیحد پرسکون ہے۔ اسکے چاروں طرف خوبصورت پھول کھلے ہیں اور ہوا کے نرم نرم جھونکوں سے ستاور پھول جھوم رہے ہیں۔..... میں نے اس کے پاس پہنچنے کیلئے چھلانگ لگانا چاہی کہ کسی نے پیچھے سے میرے دامن کو پکڑ لیا پیچھے مڑے بغیر میں نے کہا۔ "تم کون ہو؟"

"تم یہ نہ پوچھو کہ میں کون ہوں؟ بلکہ یہ بتاؤ کہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"میں اپنے ساتھی کے ساتھ پہنچنا چاہتا ہوں"۔

"اگر چھلانگ لگانے سے تم اسے پاؤگے نہیں بلکہ کھو دوگے"

"تو پھر میں کیسے اسکے پاس پہنچ سکتا ہوں"۔

"انتظار کرو"۔

"انتظار کروں۔ یہ کہہ کر میں پیچھے مڑا۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا، کوئی نہیں ہے، مگر آواز حقیقت تھی لہٰذا میں انتظار کرنے لگا میں، تنہائی اور انتظار... بڑی عجیب کیفیت تھی۔ میں اکتا گیا۔ آخر کب تک انتظار کرتا رہا؟ کب تک؟..... اور اکتا کر میں نے میں نے چھلانگ لگا دی۔ سمندر متحرک ہو گیا۔ زبردست موجیں اٹھنے لگیں اور میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ پھر میں تھک گیا اور خود کو موجوں کے حوالے کر دیا۔ میں بہتا چلا جا رہا تھا۔ معاً میری نظر پاس ہی ایک کشتی پر پڑی۔ اس میں پتوار رکھا تھا۔ اور کھینے والا کوئی نہیں تھا ہمت کر کے میں اس کی طرف بڑھا اور کشتی پر سوار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں نے اطمینان کی سانس لی اور پتوار اٹھا کر کھینے لگا میں نے ساحل پر جانے کی بے انتہا کوشش کی مگر ساحل

دور ہی رہا۔ پھر ایک قہقہہ بلند ہوا اور زور کی ہوا چلنے لگی۔ میری کشتی کی سمت بدل گئی اور بیچ سمندر میں رواں ہو گئی۔ فضا میں گھنگھور چھا گیا اور بارش ہونے لگی۔ بارش کا رنگ سرخ تھا۔ میں نے غور سے دیکھا واقعی یہ بارش نہ تھی، خون تھا، میں خون میں نہایا ہوا تھا مجھ سے برداشت نہ ہوا اور بے ہوش ہو گیا۔

جب میں ہوش آیا تو میری کشتی ایک چھوٹے جزیرے کے کنارے لگی تھی اور مجھے دو حبشی جھنکڑی پہنا رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا "یہ تم کیا کر رہے ہو"؟ کیوں کر رہے ہو؟ وہ خاموش رہے۔ میں نے اپنا سوال کو دہرایا مگر وہ خاموش رہے اور ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھتے رہے۔ پھر ان دونوں نے مجھے کشتی سے اتارا اور جزیرے کے اندر لے گئے۔ چٹانوں کے وسط میں ایک قد آور برگد کا درخت تھا۔ انہوں نے مجھے برگد کے درخت کے نیچے ایک چٹان پر بٹھا دیا۔ میں نے اوپر نظر کی۔ ان گنت رنگ برنگ کے سانپ اس کی ڈالیوں سے لپٹے ہوئے تھے میں لرزہ بر اندام ہو گیا۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیوں ہو رہا ہے؟ دفعتاً حبشیوں نے میرے پاؤں باندھ دیئے اور درخت کی ڈال سے الٹا لٹکا دیا۔ میں نے ڈالیوں سے لپٹے سانپوں کو دیکھ نہیں سکتا۔ مگر مجھے ہر لحظہ یہ خوف ہے کہ وہ سب میرے قریب آ رہے ہیں اور مجھ سے لپٹنے والے ہیں اُف کتنا اذیت ناک ہے یہ احساس۔ کاش میں انتظار نہ کرتا۔ سمندر کا آئینہ تو ٹوٹ ہی جاتا ——

ALWAYS ASK FOR:-

KALA GULAB

MARKA

GUL

کالا گلاب مارکہ گل

ABDUR RASHID & SONS

TOBACCO GUL MANUFACTURER

Railpar, BELDANGA

P.O. ASANSOL · 713302.

چیونٹے اور اشوک

اسد زیدی

ایک بار ہم اشوک کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ آغازِ گفتگو دیں ہی اس کا دھیان (لہٰذا ہمارا بھی) میز پر چلتے ہوئے ایک چیونٹی پر مرکوز ہو گیا۔ یکایک اشوک نے پوچھا۔ "بتاؤ یہ چیونٹا کس طرف جائے گا۔"

ہم نے کہا۔ "یہ کیا بات ہوئی۔"

اشوک ہنسا۔

ہم نے کہا۔ "وہ چیونٹا شکر کے دانے کی طرف جائیگا۔"

اشوک نے کہا۔ "اچھا۔ دیکھتے ہیں۔"

چیونٹا ہمارے اندازے کے خلاف شکر کے دانے کے عین برابر سے گزرتا ہوا آگے نکل گیا۔

اشوک نے کہا "اب؟"

ہم نے کہا "اب یہ چیونٹا میز کا چکر لگائے گا۔"

اشوک نے پوچھا "کیوں؟"

ہم نے کہا۔ "چیونٹے خواہ چوکور میز پر ہوں یا گول پر، ہمیشہ گولائی پر چلتے ہیں"۔ حالانکہ چیونٹا سیدھا میز کے کنارے پر جا کر نیچے اتر گیا۔

"وہ کہاں گیا؟" اشوک نے کچھ دیر بعد پوچھا

ہم نے کہا "غائب ہو گیا"۔

اشوک بولا "نہیں، وہ اب بھی میز کے نیچے مل رہا ہے" ہمارے جو توں تلے تب چیونٹے کا مسل دیا اور کہا "اب چیونٹے کے بارے میں یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ مر گیا ہے"۔

اشوک نے بہت آہستہ سے کہا۔ "مگر اس سے چیونٹوں کو سمجھنے میں کیا مدد ملتی ہے! بیوقوفو!"

"تمہاری عقلمندی دیکھی جا چکی ہے" ہم نے کہا

اشوک بولا "۔ ٹھیک ہے مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے!"

▲

علقمہ شبلی
کا شعری مجموعہ
"بے چہرہ لمحے"
قیمت دس روپے

محبوب انور کا
شعری مجموعہ
نقطے کا سفر
بہت جلد منظرِ عام پر آ رہا ہے
پہچان پبلیکیشنز۔ معصوم محلہ۔ آسنسول

سوئی کی نوک، سورج کی آنکھ

معراج الحق

وہ اس کا دشمن تھا، مگر اس نے اس سے دوستی پیدا کی ـــــ گہری، گاڑھی، خوب گہری، خوب گاڑھی دونوں ہم نوالہ اور ہم پیالہ بن گئے ـــــ اور پھر اس نے ایک دن ـــــ جس دن سورج اپنی بینائی سے محروم تھا، سڑکوں پر کالی کالی پرچھائیں تھی تھیں، ـــــ اس کے جسم میں سوئی کی نوک سے ایک خراش ڈال دی، ـــــ خراش معمولی تھی، لیکن پورے بدن میں جیسے بجلی سرایت کر گئی۔ اس کے ہونٹ کٹ کر سڑک پر گر گئے، ـــــ اس کی زبان جو اب باہر نکل آئی، اور وہ دوڑنے لگا ـــــ

دوسرے دن ـــــ جس دن سورج اپنی تیسری آنکھ بھی زمین پر گاڑ رکھی تھی، ـــــ اس نے تھوڑی ہی صرف تھوڑی ہی سوئی کی نوک اس کے جسم میں چبھو دی، ـــــ اس بار اس کی انگلیاں ہتھیلی سے الگ ہو گئیں۔ ناک سے لعاب خارج ہونا شروع ہو گیا ـــــ اور وہ پھر تیزی سے دوڑنے لگا۔

پھر تیسرے دن ـــــ سورج اپنی تمام آنکھیں کھولے تھا، سڑک پر چاروں اور سناٹا تھی، ہر آدمی اپنے اپنے چہرے کی تلاش میں سرگرداں تھا، ـــــ اس نے موقع پا کر اس کے جسم میں پوری سوئی پیوست کر ڈالی ـــــ اس بار اس کی آنکھیں زمین پر تڑپنے لگیں اور وہ بے تحاشا دوڑنے لگا، ـــــ دوڑتا رہا، ـــــ یکایک وہ رکا، ـــــ پانی میں اپنا عکس دیکھا، اس کے سینے پر دو آنکھیں نکل آئی تھیں ـــــ اور گردن سے اوپر کا حصہ غائب ہو چکا تھا، ـــــ پھر وہ دوڑنے لگا، اپنی پوری طاقت سے، ـــــ دوڑتا رہا ـــــ لیکن اچانک آنکھیں زمین پر گر گئیں۔ وہ منہ کے بل گرا۔ اور مر گیا ـــــ

تب اس نے اس کے مردہ جسم کو مسکراتے ہوئے بانہوں میں اٹھا لیا۔ اسے زور سے بھینچا، اور کندھے پر اٹھائے ہوئے لوگوں کے سامنے لایا ـــــ اس بار اس کا جسم اپنی مکمل حالت میں تھا کندھے سے نیچے اتارتے ہوئے انتہائی حزن و ملال کے ساتھ، چہرے پر غم و یاس کے احساسات لاتے ہوئے کہہ رہا تھا" ....

▲▲

بوتل

خاور سعید

بارش میں تر اور لباس میں سے جھلکتے ہوئے اس کے بدن کے قیامت خیز ابھار بھیگے ہوئے موسم میں آگ لگا رہے تھے۔ ٹانگوں سے چپکی ہوئی شلوار سے اکتاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی شیلٹر کی طرف لپکی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور شلوار کے مختلف حصوں کو بل دیتے ہوئے پانی نچوڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ قریب ہی کھڑے دو نوجوان اس پر یوں پیاسی نظریں جمائے ہوئے تھے جیسے ان کا بس چلے تو اسکے کپڑوں کا تمام پانی چوس لیں۔ ایک لڑکا خاصا خوش شکل تھا۔ اس کی نظروں کی گرمی لڑکی نے اپنے گداز جسم پر محسوس کی اور وہ اسے کنکھیوں سے دیکھنے لگی۔ بارش کے جوش و خروش میں کمی آتی جا رہی تھی لیکن لڑکے کی پیاس بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے ساتھی کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ لڑکی کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ دونوں لڑکے آگے بڑھے "بارش تھم گئی ہے، برا نہ مانیے تو آئیے سامنے والے ہوٹل میں ایک کپ چائے ہو جائے، موسم خنک ہو چلا ہے۔ لڑکے نے آہستہ سے آفر کی۔

لڑکی شرمائی لیکن آنکھوں کا جادو چل چکا تھا، نہ چاہتے ہوئے بھی اسکے پاؤں حرکت میں آ گئے اور کچھ دیر بعد وہ تینوں ہوٹل کے کمرے میں خاصے بے تکلف ہو چکے تھے۔ بوتل ایک تھی اور پینے والے دو۔ انہوں نے باری باری پیگ بنائی اور پیاسے شکاریوں کی طرح ہانپتے ہوئے چند ہی سانسوں میں چڑھا گئے۔ بوتل خالی ہو چکی تھی انہوں نے بل ادا کر دیا۔ دونوں شرابی نشے میں جھومتے ہوئے میخانے سے باہر نکلے اور تھکی ہاری نوجوان لڑکی کو اکیلی چھوڑ کر چلے گئے۔

کچھ عرصہ بعد خوش شکل لڑکے کی شادی تھی۔ سہاگ رات جب دلہا نے دلہن کا گھونگھٹ اٹھایا تو اس کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا۔ "عروسی جوڑے میں وہی ہوٹل والی خالی بوتل تھی"۔

▲

تبسمِ ظریفی

ایم عالم

ہمارا سیٹھ آج بھرا ہوا تھا "ایک سو پچیس روپے میں تمہارا کام نہیں چلتا؟ تمہارے بچے اور بچیاں کالج اور اسکول میں پڑھتے ہیں! تم کو ہر ماہ فیس دینا پڑتی ہے' کتابیں اور کاپیوں پر پیسے خرچ ہوتے ہیں۔ تو ایسا کیوں نہیں کرتے: بچوں کی پڑھائی ختم کرا دو نئے بچے پیدا کرنا بند کر دو ـــــ میں ایک سو پچیس روپے سے ایک پائی بھی زیادہ نہیں دے سکتا' ـــــ تم چاہو تو رہو یا چلے جاؤ"!

دوسرے دن ہمارے سیٹھ کے کمرے سے آواز آ رہی تھی "یار کیا کریں! مزدوروں نے کارخانہ بھی چل نکلا ہے لیکن دوست! مہنگائی اس قدر ہے' انٹرٹینمنٹ پر اتنے خرچ ہوتے ہیں کہ چار ہزار روپے ماہوار خرچ کرنے پر بھی گھر کی کفالت بحسن و خوبی نہیں ہو پاتی"

اور میں سوچنے لگا کہ ہمارے سیٹھ ہمیشہ اپنے ملازموں پر تنخواہ کے سلسلے میں جھڑکتے رہتے ہیں ذرا کسی نے کبھی تنخواہ سے کچھ زیادہ طلب کی تو آنکھیں باہر نکال لیتے ہیں اور ہاں! جس دن تنخواہ تقسیم کرتے ہیں' اس دن تو آنکھیں لال لال رہتی ہیں! افسوس! وہ دوسروں کیلئے ایک سو پچیس روپے ماہوار کافی سمجھتے ہیں اور اپنے لئے چار ہزار بھی ناکافی ـــــ

جدید ادب کا حساس پیمانہ
ماہنامہ
"جواز"
مدیر: سید عارف
مولانا آزاد روڈ، نیا پورہ، مالیگاؤں (ناسک)

اردو کا پچاس سالہ علمی ادبی اور تہذیبی
ماہنامہ
"شاعر"
مدیر: افتخار امام صدیقی
ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، پوسٹ بکس نمبر ... بمبئی

____ آدھی رات کا پہر تھا، نوشی کی آنکھ کھل گئی اسے سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی۔

وہ جاگتی، سوتی، سلیپر گھسیٹتی اٹھی، ابھی اس نے فریج کا دروازہ کھولا ہی تھا اسے عجیب قسم کی کھسر پھسر کی آوازیں سنائی دیں۔ اسکے تو جیسے اوسان خطا ہو گئے، جتنی آیتیں اسے زبانی یاد تھیں اس نے سینہ پڑھ ڈالیں۔ فریج سے پانی نکال کر پیا تب کچھ کم ہوا، لیکن پھر ایسی آوازیں ابھریں کہ اسے یوں لگا جیسے گھر میں کوئی چور گھسا ہوا ہے۔ وہ ماما کے کمرے کی طرف دوڑی۔ کمرے میں مدھم لائٹ جل رہی تھی۔ وہ دروازہ کھٹکھٹانے لگی تو نوشی کا اس کا اٹھا ہوا ہاتھ یکدم رک گیا۔ آوازیں اندر سے آ رہی تھیں معاملہ کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنے لگا تھا۔ جلدی کیا اسے سوجھی کہ ریلنگ کا دروازہ کھول کر برآمدے میں چلی گئی اور دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ساتویں سیڑھی پر پہنچ کر وہ رک گئی اور جھک کر روشندان میں سے تھوڑا سا اندر جھانکا۔ ابھی تو اسے پوری طرح نظر آئیں لیکن پاپا پلنگ پر اوندھے پڑے [illegible] دکھائی دیتے تھے۔ ان کا جسم [illegible] ہلکورے لے رہا تھا جیسے کوئی کشتی [illegible] ہلا دینے لگی ہو۔ اسکے سارے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ وہیں سیڑھی پر بیٹھ گئی۔ اس نے [illegible]

اگلے روز کالج پہنچ کر اس نے خوب مزے لے لے کر رات کا واقعہ سہیلیوں کو سنایا وہ کھلکھلا کر ہنستی رہیں۔ غزالہ تو اتنا ہنسی کہ اسکے ہاتھ سے کتابیں چھوٹ کر گر گئیں۔ نوشی کے جذبات میں ہلچل سی مچی رہنے لگی رہ رہ کر وہ منظر یاد آ رہا تھا۔ وہ ماموں کراچی گیا ہوا تھا۔ بھی وہ [illegible] سنبھلی تھی لیکن [illegible] سکتی تھی کہ صرف ایک ہفتے کی چھٹی اس کے لئے سو سال [illegible] بن جائے گی۔ نجم [illegible] دوڑ [illegible] بھی [illegible] مگر پر اکیلا ہی ہوتا تھا اور اکثر نوشی کو گھر پر آنے کی دعوت دیتا رہتا تھا۔ نوشی اسے [illegible] تھی لیکن اب تو اس کی تو بہت کیفیت تھی آخر ایک ہفتہ بھی بیت گیا [illegible]

ماں گھر لی اور شام کو وہ [illegible] ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ نوشی: کوئی بات ہوتا [illegible] جذبات سے مغلوب ہو رہا لیکن [illegible] اس دن موسم کچھ کچھ [illegible] تھا [illegible] اور نجم نے اسے [illegible] سیدھا [illegible] ان کے سینوں [illegible] اسکی شدت [illegible] سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ ایک دوسرے میں جذب ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ نوشی [illegible] بار بار [illegible] رہے تھے۔ آج وہ لذت درد آشنا ہو گئی تھی [illegible] ٹانگ [illegible] پلنگ پر پڑی تھی۔ نجم اٹھ کر صوفے پر جا بیٹھا "آؤ نوشی، بیٹھو" وہ صوفے پر جا بیٹھی [illegible] چادر پر پھیلا [illegible] چادر اپنے آپ [illegible] لگا جیسے اس [illegible] ماحول میں اس کا دم گھٹ جائیگا۔

[illegible] لہجے میں کہا "نجم! جب ہم اپنا مکان بنائینگے تو اسکے بیڈ روم میں روشندان نہیں رکھیں گے" ____

٩٢

نو لفٹ

نازنین منہاس

ہر آوارہ مزاج امیر زادے کی طرح وہ بھی سارا دن اپنی خوبصورت فیئٹ کو سڑکوں پر بھگاتا پھرتا۔ اس کی نگاہیں لفٹ کی متلاشی خوبصورت لڑکیوں کی تلاش میں رہتیں۔ خوبصورت لڑکیوں کا قرب اسے بہت بھاتا تھا۔ پھر کبھی کبھی تو کوئی لفٹ کی متلاشی لڑکی اس کی خواہشات کی تسکین کا سامان بھی بن جاتی تھی۔

اس روز تو وہ خود کو بہت لکی محسوس کر رہا تھا۔ اتنی خوبصورت لڑکی اس سے پہلے کبھی اس کی گاڑی میں نہیں بیٹھی تھی۔ "آپ کہاں اتریں گی" اس نے بڑی شائستگی سے پوچھا۔ "جی مجھے پرنس اسٹریٹ اتار دیجئے گا" "او تھینکس، آپ مجھے پرنس اسٹریٹ ہی اتار دیجئے" ـــــ "بہت اچھا..... اچھا تو یہ بتائیں آپ کہیں پڑھتی ہیں؟" وہ گفتگو کو طول دینا چاہتا تھا ـــــ "جی نہیں، پڑھائی چھوڑے مجھے دو سال ہو چکے ہیں آج کل ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم ہوں" ـــــ "اوہ تو بھلا آپ نے تعلیم کیوں چھوڑ دی؟ خیر یہ تو آپ کا ذاتی مسئلہ ہے، ہاں اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"کیوں" لڑکی نے عجیب انداز میں کہا ـــ "اوہ! بس، بس یوں ہی"۔

"آخر یوں ہی کیوں" "آپ گاڑی میں لفٹ دیکر لڑکیوں کے نام پوچھ کر جملہ کوائف معلوم کرنے کے عادی لگتے ہیں"

"جی نہیں، دراصل، دیکھئے وہ بات یہ ہے کہ آج تک جتنی لڑکیوں نے میری گاڑی میں لفٹ لی ہے ان میں آپ سب سے زیادہ خوبصورت ہیں"۔ ـــــ "تو یہ بات ہے" لڑکی کی مسکراہٹ نے اس کی ہمت بڑھائی۔

"اچھا تو میرا نام جبین ہے" ـ پھر لڑکی نے خود ہی نام بتا دیا۔ "جی شکریہ" اس نے کار کی رفتار کافی آہستہ کر دی تاکہ فاصلہ زیادہ سے زیادہ وقت میں طے ہو سکے "آپ کار بہت آہستہ چلانے لگے، کیوں؟" "میں چاہتا ہوں کہ آپ کا گھر کبھی نہ آئے اور میں آپ سے باتیں کرتا رہوں" ـــــ "کیا آپ یونہی رومانٹک ہو رہے ہیں؟"

"جی نہیں، میں نے کہا نا، آپ کے ساتھ ـــ" ـــ "اچھا یہ بتائیے کہ آپ کرتے کیا ہیں؟"

"بس کیا ہے خدا کا فضل ہے، کسی چیز کی کمی نہیں، بس ایک تمنا ہے ....." ـــ "اچھا صاحب مجھے تو بس اس دکان کے سامنے اتار دیں" "بس یہیں؟" اس نے کار روکی، لڑکی نے شکریہ ادا کیا اور چلتے ہوئے بولی "آپ نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں نے آپ کا نام کیوں نہیں پوچھا؟"

"ارے ہاں واقعی، بھلا بتائیے تو؟" ـــ اس نے دانت نکالتے ہوئے کہا "اسلئے کہ آج تک میں نے جتنی گاڑیوں میں لفٹ لی ہے ان کے مالکوں میں سے آپ سب سے زیادہ بدصورت لگے" ـــ یہ کہہ کر لڑکی تیزی سے آگے بڑھ گئی، اور وہ ساکت رہ گیا۔

عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

سید منظر امام

• "منتخب غزلیں" مرتب: سرور عثمانی' انتخاب: فرحت قادری' مناظر عاشق ہرگانوی سنہ ۱۹۸۰ء میں شائع شدہ ان غزلوں کا مجموعہ ہے جو اردو کے مختلف جرائد میں شائع ہو چکی ہے ۔

اس سے پہلے کہ اس کتاب پر تبصرہ کیا جائے ایک واقعہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے ہمارے شہر کی ایک مسجد میں مسلمانوں کا عالمی اجتماع ہوا ۔ یہ اجتماع عالمی اسلئے تھا کہ اس میں ایک صاحب اتفاق سے ترکی سے آئے ہوئے تھے ۔

زیر نظر کتاب میں اردو غزلوں کا عالمی انتخاب ہے جیسا کہ سرور عثمانی "زیب سخن" میں فرماتے ہیں: "اس انتخاب میں چند ایسے بھی شعراء ہیں جن کا نام عالمی ادب میں انتہائی عزت و احترام سے لیا جاتا ہے" اور اس کے بعد اردو والوں کو یہ مژدہ جانفزا بھی سناتے ہیں" اردو زبان و ادب علی الخصوص شاعری دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں اپنا دائرہ اثر وسیع کر چکی ہے ۔"

یہاں اپنا عالم یہ ہے کہ اس حقیقت سے بھی ماتم کرتے نجات نہیں ملی کہ کلیم الدین احمد نے اقبال جیسے شاعر کو بھی عالمی شعراء کے مقابلے میں رکھنے سے انکار کر دیا ہے اور جہاں تک اردو کا سوال ہے خود اپنے وطن میں اجنبی ہوتی جا رہی ہے ۔

خیر، خوش فہمی جیسی بھی ہو' اچھی ہے' شاید اسی لئے یہ بات کہی گئی ہے کہ دانا لوگوں سے بہتر نادان ہیں جو چین سے جی تو لیتے ہیں ـــــ سرور عثمانی کو یہ خوش فہمیاں مبارک ہو ۔

"زیب سخن" میں چند اور بھی انکشافات "پیمبرانہ" حیثیت کے ہیں ۔ مثلاً سرور عثمانی کا ارشاد ہے کہ (اس انتخاب) میں نئی نسل کے ایسے ان گنت شعراء ہیں جن کی شاعری آنے والے دنوں میں درجہ اعتبار کو پہنچ جائیگی ۔ بھلا! آپکو کون یہ سمجھائے کہ شاعر بہت خون جگر کرتا ہے تب کہیں جاکر معتبر بنتا ہے اور اعتبار کا یہ درجہ ہر کسی کا مقدر نہیں ہوتا' چہ جائیکہ ان گنت ؟"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرور عثمانی نے جدیدیت' ترقی پسندی اور روایت سے متعلق کچھ باتیں ادھر ادھر سے سن رکھی ہیں ۔ انہیں یہ بھی خبر نہیں کہ جدیدیت' ترقی پسندی اور روایت مختلف بلکہ کسی حد تک متضاد اور متخالف رجحانات کے نام ہیں ۔ اگر وہ اس حقیقت سے باخبر ہوتے تو آسانی سے یہ نہیں لکھ جاتے "مندرجہ بالا شعری کینوس پر کیا ہر شاعر جدید نظر نہیں آتا ؟ کیا ترقی پسندی کا نشہ ہمارے سر و دل میں اب بھی جاں گزیں نہیں ؟ کیا ہم نے انتہائی کوشش

لو لفٹ

نازنین منہاس

ہر آوارہ مزاج امیر زادے کی طرح وہ بھی سارا دن اپنی نئی خوبصورت فیئٹ کو سڑکوں پر بھگائے پھرتا اس کی نگاہیں لفٹ کی متلاشی خوبصورت لڑکیوں کی تلاش میں رہتیں۔ خوبصورت لڑکیوں کا قرب اسے بہت بھاتا تھا۔ پھر کبھی تو کوئی لفٹ کی متلاشی لڑکی اس کی خواہشات کی تسکین کا سامان بھی بن جاتی تھی۔

اس روز تو وہ خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ اتنی خوبصورت لڑکی اس سے پہلے کبھی اس کی گاڑی میں نہیں بیٹھی تھی "آپ کہاں اتریں گی" اس نے بڑی شائستگی سے پوچھا "جی مجھے پرنس اسٹریٹ اتار دیجئے گا" "تو تھینکس، آپ مجھے پرنس اسٹریٹ ہی اتار دیجئے" --- "بہت اچھا.... اچھا تو یہ بتائیں آپ کہیں پڑھتی ہیں" وہ گفتگو کو طول دینا چاہتا تھا --- "جی نہیں پڑھائی چھوڑے مجھے دو سال ہو چکے ہیں آج کل ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم ہوں" --- "اوہ تو بھلا آپ نے تعلیم کیوں چھوڑ دی؟ خیر یہ تو آپ کا ذاتی مسئلہ ہے، ہاں اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"کیوں" لڑکی نے عجیب انداز میں کہا --- "اوہ! بس، بس یوں ہی"۔

"آخر یوں ہی کیوں" "آپ گاڑی میں لفٹ دیکر لڑکیوں کے نام پتہ جملہ کوائف معلوم کرنے کے عادی لگتے ہیں"

"جی نہیں، دراصل، دیکھئے وہ بات یہ ہے کہ آج تک جتنی لڑکیوں نے میری گاڑی میں لفٹ لی ہے ان میں آپ سب سے زیادہ خوبصورت ہیں"۔ --- "تو یہ بات ہے" لڑکی کی مسکراہٹ نے اس کی ہمت بڑھائی۔

"اللہ اللہ میرا نام جبین ہے" پھر لڑکی نے خود ہی نام بتا دیا۔ "جی شکریہ" اس نے کار کی رفتار کافی آہستہ کر دی تاکہ فاصلہ زیادہ سے زیادہ وقت میں طے ہو سکے "آپ کار بہت آہستہ چلانے لگے، کیوں؟"

"میں چاہتا ہوں کہ آپ کا گھر کبھی نہ آئے اور میں ایسے باتیں کرتا رہوں" --- "کیا آپ یونہی رومانٹک ہوتے ہیں"

"جی نہیں، میں نے کہا نا، آپ کے ساتھ ---" --- "اچھا یہ بتائیے کہ آپ کرتے کیا ہیں؟"

"بس کیا ہے خدا کا فضل ہے، کسی چیز کی کمی نہیں، بس ایک تمنا ہے ----" "اچھا صاحب مجھے تو بس اس دکان کے سامنے اتار دیں" "بس یہیں؟" اس نے کار روکی، لڑکی نے شکریہ ادا کیا اور چلتے ہوئے بولی" آپ نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں نے آپ کا نام کیوں نہیں پوچھا؟"

"ارے ہاں واقعی، بھلا بتائیے تو؟" --- اس نے دانت نکالتے ہوئے کہا "اس لئے کہ آج تک میں نے جتنی گاڑیوں میں لفٹ لی ہے ان مالکوں میں سے آپ سب سے زیادہ بدصورت لگے" --- یہ کہہ کر لڑکی تیزی سے آگے بڑھ گئی، اور وہ ساکت رہ گیا۔

عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیئے

سید منتظر امام

• منتخب غزلیں" مرتب: سرور عثمانی "انتخاب: فرحت قادری" مناظر عاشق ہرگانوی ۱۹۷۷ء میں شائع شدہ ان غزلوں کا مجموعہ ہے جو اردو کے مختلف جرائد میں شائع ہو چکی ہے۔

اس سے پہلے کہ اس کتاب پر تبصرہ کیا جائے ایک واقعہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے ہمارے شہر کی ایک مسجد میں مسلمانوں کا عالمی اجتماع ہوا۔ یہ اجتماع عالمی اسلئے تھا کہ اس میں ایک صاحب اتفاق سے ترکی سے آئے ہوئے تھے۔

زیر نظر کتاب میں اردو غزلوں کا عالمی انتخاب ہے جیسا کہ سرور عثمانی "زیب سخن" میں فرما چکے ہیں "اس انتخاب میں چند ایسے بھی شعراء ہیں جن کا نام عالمی ادب میں انتہائی عزت و احترام سے لیا جاتا ہے" اور اسکے بعد اردو والوں کو یہ مژدہ جانفزا بھی سناتے ہیں" اردو زبان و ادب علی الخصوص شاعری دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں اپنا دائرہ اثر وسیع کر چکی ہے"۔

یہاں اپنا عالم یہ ہے کہ اس حقیقت سے بھی ماتم کرتے نجات نہیں ملی کہ کلیم الدین احمد نے اقبال جیسے شاعر کو بھی عالمی شعراء کے مقابلے میں رکھنے سے انکار کر دیا ہے اور جہاں تک اردو کا سوال ہے خود اپنے وطن میں اجنبی ہوتی جا رہی ہے۔

خیر، خوش فہمی جیسی بھی ہو، اچھی ہے، شاید اسی لئے یہ بات کہی گئی ہے کہ دانا لوگوں سے بہتر نادان ہیں جو چین سے جی تو لیتے ہیں ——— سرور عثمانی کو یہ خوش فہمیاں مبارک ہو۔

"زیب سخن" میں چند اور بھی انکشافات "پیمبرانہ" حیثیت کے ہیں۔ مثلاً سرور عثمانی کا ارشاد ہے کہ (اس انتخاب) میں نئی نسل کے ایسے ان گنت شعراء ہیں جن کی شاعری آنے والے دنوں میں درجہ اعتبار کو پہنچ جائیگی۔ بھلا! آپکو کون یہ سمجھائے کہ شاعر بہت خون جگر کرتا ہے تب کہیں جاکر معتبر بنتا ہے اور اعتبار کا یہ درجہ ہر کسی کا مقدر نہیں ہوتا" چہ جائیکہ ان گنت؟"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرور عثمانی نے جدیدیت، ترقی پسندی اور روایت سے متعلق کچھ باتیں ادھر ادھر سے سن رکھی ہیں۔ انہیں یہ بھی خبر نہیں کہ جدیدیت، ترقی پسندی اور روایت مختلف بلکہ کسی حد تک متضاد اور متخالف رجحانات کے نام ہیں۔ اگر وہ اس حقیقت سے باخبر ہوتے تو آسانی سے یہ نہیں لکھ جاتے" مندرجہ بالا شعری کینوس پر کیا ہر شاعر جدید نظر نہیں آتا؟ کیا ترقی پسندی کا کانٹا ہمارے سر دلوں میں اب بھی جاں گزیں نہیں؟ کیا ہم نے انتہائی کوشش

کے باوجود پرانی قدروں کو گلے سے لگا نہیں رکھا ہے؟ اس کے باوجود جدیدیت، ترقی پسندی اور کلاسیکی شاعری کا جھگڑا اردو زبان و ادب کی بے سمتی کیوں علامت نہیں ہے؟"

حضرت! شاید آپکو معلوم نہیں کہ جدیدیت کا ایک میلان یہ بھی ہے اور اس کا تعلق ترقی پسندی، جدیدیت اور کلاسیکی شاعری کے جھگڑے سے نہیں ہے۔ معلوم نہیں آپنے جدیدیت، ترقی پسندی اور کلاسیکی شاعری کی اصطلاحوں کو سمجھا بھی یا نہیں۔

ویسے ہم آپ کی اس کوشش کو خالص "ادبی ترنگ" تو نہیں "ترنگ" کا نام ضرور دیتے ہیں اور ظاہر ہے یہ کیفیت ہے کہ بولنے والے کو ٹوکا نہیں جاتا۔ شرفاء عموماً ایسے موقعوں پر کنی کترا جاتے ہیں۔

اس انتخاب میں ۱۹۳ شعراء کی غزلیں شامل ہیں جبکہ منتخب شعراء ہر دور میں گنتی کے ہوتے ہیں اور ایسے اشعار تو شاذ و نادر ہی کہے جاتے ہیں جنہیں انتخاب کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں ترقی پسندوں کے نکلنے سے سال میں ایک آدھ انتخاب شائع کرنے کی رسم قائم ہے اور اسکو ہم برا بھی نہیں کہتے۔ بہت اعلیٰ درجے کی نہیں تو کم سے کم ایک ہی جگہ کچھ پیاری، دلکش اور خوبصورت چیزیں پڑھنے کو مل جاتی ہیں اور یہ بھی بہت غنیمت ہے۔

اصل شکایت اسوقت پیدا ہوتی ہے جب مرتبین اپنے انتخاب کو منفرد ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ساتھ ہی اپنے ایماندار اور غیر جانبدار ہونے کا بھی دعویٰ کرتے ہیں۔ ۱۹۳ شاعروں کی اس لمبی فہرست میں ہمیں دکھ ہوتا ہے جب چند معروف ناموں کو نہیں دیکھتے۔ احمد فراز، صہبا اکرام، سید احمد شمیم، احمد مشتاق، قیوم صبا، اقبال منہاس، بدنام نظر اور مصطفیٰ مومن وغیرہ جیسے جانے پہچانے اور خوش گو غزل سرا اس فہرست میں شامل نہیں ہیں اور ان کا مقابلہ نہایت کمتر درجے کے شعراء کی اوچھی، پھیکی اور بے روح غزلیں نظر آتی ہیں۔

میر تقی میر نے کہا تھا "عیب بھی کرنے کو ہنر چاہئے" لیکن بدمذاقی ہنر کو بھی عیب بنا کر دکھاتی ہے جسکی ایک مثال یہ انتخاب بھی ہے۔ اس انتخاب میں کچھ ہی ایسی غزلیں ملتی ہیں جنہیں پڑھ کر بدحالی استراز حاصل ہوتا ہے اور جن میں فنی رعنائی، صوری خوبصورتی اور روح عصر کی دھڑکنیں ملتی ہیں۔ اگر انتخاب کرنے والوں میں تھوڑی سی خوش ذوقی اور خوش سلیقگی ہوتی تو وہ مجموعے میں شریک کئی شعراء کی نسبتاً بہتر غزلیں شامل کرتے۔

انتخاب کا معاملہ تو خیر بصیرت سے تعلق رکھتا ہے لیکن منتخب غزلیں مرتب کی بصارت کا بھی رونا ہیں۔ کاغذ اچھا ہے۔ کتابت طباعت بھی بری نہیں ہے مگر تزئین کا بالکل خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ ایک ہی صفحہ پر دو دو غزلیں دیکھ کر خوش فطری مجروح ہوتی ہے۔ سرورق بھی نہایت پھیکا سا ہے اور ... سا اور عمر ایسی کتابوں پر نظر آتا ہے جو صرف تجارتی نقطۂ نظر سے چھاپی جاتی ہے۔

(باقی صفحہ پر)

اس موقع پر ساحل احمد کا مرتب کردہ "۱۹۷۷ء کا شعری ادب" یاد آتا ہے جس میں مرتب کی خوش سلیقگی نفاست، ذہانت اور بصیرت کے چراغ جگہ جگہ روشن نظر آتے ہیں ۔

سرور عثمانی، فرحت قادری، اور مناظر عاشق ہرگانوی صاحبان کو میرا مشورہ ہے کہ ساحل احمد کے انتخاب کا بغور مطالعہ کریں اور کچھ سیکھیں۔ امید ہے آئندہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

اس انتخاب میں "نئی اردو غزل" پر ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک مضمون بھی شامل ہے۔ اس مضمون کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وزیر آغا نے آج تک کوئی ایسی تحریر نہیں لکھی جس نے شعر و ادب کے کسی نہ کسی گوشے کو روشن نہ کیا ہو۔ سچی بات تو یہ ہے کہ پوری کتاب میں پڑھنے کی بس یہی ایک چیز ہے ۔

▲▲

تبصرہ

آئندہ شمارہ سے کتابوں پر ملک کے مشہور ناقدوں سے طویل تبصرے لکھوائے جائینگے۔ تبصرہ کیلئے کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے۔ اگر کتاب کی قیمت ۲۰ روپے سے زائد ہے تو اس کی ایک ہی کاپی بھیجئے۔

تخلیقات

پہچان کیلئے اپنی تخلیقات بھیجتے وقت اس کے خالص ادبی معیار کا لحاظ رکھیں ۔

شمارہ ۳

آئندہ شمارہ جولائی ۹۷ء کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوگا اس کی ضخامت دوگنی کردی جائے گی ۔

اس شمارے سے متعلق اپنی رائیں ہمیں لکھیئے

Accession Number 126254
Date 22-12-91

آخری سطور

سید محمد جلال حمیدی

اردو زبان کی اس بدقسمتی پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے کہ کوئی اچھا ادبی رسالہ جتنی دھوم دھام سے شائع ہوتا ہے اتنی ہی خاموشی کے ساتھ بند ہو جاتا ہے ۔ اردو رسالہ کا اجراء اردو والوں کیلئے یقیناً باعث مسرت ہے لیکن اسکے بند ہو جانے کا قطعی افسوس نہیں ۔

اردو رسالے بند کیوں ہو جاتے ہیں ؟ یہ ایک اہم سوال ہے اور جس کا جواب ہر اردو پڑھنے اور جاننے والا اپنے آپ سے پوچھے تو اپنے اندر کے آدمی سے نظریں ملانے میں شرم محسوس کریگا۔

کیا اردو زبان سے تعلق رکھنے والوں میں قوت خرید نہیں ؟ ___

کوئی اردو رسالہ اگر بند ہوتا ہے تو اس کا ذمہ دار اردو رسالہ پڑھنے والا عام آدمی نہیں ۔ خالص ادبی رسالے عام آدمی کے مطالعے میں نہیں آتے ۔ یونیورسٹی اور کالج میں اردو پڑھانے والے اساتذہ کرام ، اردو پڑھنے والے طلباء اور اردو ادب سے تعلق رکھنے والے شاعر و ادیب ہوتے ہیں جو خاص ادبی رسالے پڑھتے ہیں ۔

اگر طلباء دیگر ضروریات تعلیمی کیساتھ ادب کی موجودہ رفتار سے واقفیت حاصل کرنے کی خاطر خالص ادبی رسالہ خریدیں تو رسالہ کیوں بند ہو ؟

اگر اردو کے اساتذہ کرام اردو رسالوں کی خریداری پر کچھ پیسے صرف کریں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اردو رسالہ بند ہو جائے ۔؟

اگر شاعر و ادیب بھی رسالے خرید کر پڑھیں تو رسالہ کیوں بند ہو ؟

اگر اس قسم کے اشخاص کی مجموعی تعداد ہندوستان میں ایک لاکھ بھی ہو تو کیا تمام اردو رسالوں کی کھپت ممکن نہیں ؟

لیکن اس طرح کی قربانی کون دیتا ہے ؟

اردو زبان کو مرتے دیکھنا گوارہ ہے لیکن اردو رسالے کی خریداری ؟

یہ ممکن نہیں ___

کاش ہم لوگ اردو سے محبت کا صحیح جذبہ رکھتے ۔

Phone: 3101 GRAM.- TAJII

With best Compliments:—

M S

ISRAIL & CO.

MIRZA GHALIB ROAD
ASANSOL.

A Big house for wholesale goods, Lungi, socks, ganji, saree, e

Stockist of:—

century mill, kesoram industries jiyajee and othersmills.

SATISFACTION IS OUR POPULARITY.

PAKISTAN

TOCHI TOCHI

TOCHI SEWING MACHINE

... Produce

... Sewing Machine ...

TOCHI